محبّت کی رات

کرشن چندر

محبّت کی رات

محبّت کی رات

کرشن چندر

مکتبہ اردو ادب لاہور
بازار ستھاں اندرون لوہاری گیٹ

جملہ حقوق محفوظ ہیں

(جملہ حقوق محفوظ ہیں)

ناشر ——— سرفراز
مطبع ——— منظور پریس لاہور
قیمت ——— [redacted] روپے

ترتیب

محبت کی رات	۷
بیوقوفی	۳۸
گومتی کنارے	۴۷
لکھ پتی بننے کا نسخہ	۵۸
ننگا رہنے پر	۷۲
حبیبہ	۸۳
آدم خور	۱۰۰
آخری بس	۱۱۵
کیا کروں ؟	۱۳۹
ایرانی پلاؤ	۱۶۱

محبّت کی رات

گھاٹی کی گود میں دو راستے تھے۔

ایک راستہ تو گھاٹی کے اوپر سے جاتا تھا اور دیار اور چیل کے درختوں سے گزرتا تھا۔ دوسرا گھاٹی کے قدموں سے لگ کے وادی کے کنارے کنارے چل رہا تھا۔ جہاں دھان کے کھیت تھے۔ اور کھیتوں کے کنارے مویشی چر رہے تھے اور راستے کے اوپر ترنساری اور نیلا دھاری کی بیلیں جھکی ہوئی تھیں۔ ان دونوں راستوں کے بیچ میں یہ گھاٹی تھی لیکن بہت اونچی نہیں تھی اس لئے اوپر کے راستے سے نیچے کا راستہ اور نیچے کے راستے سے اوپر کا صاف نظر آتا تھا۔

اوپر کے راستے سے ایک نوجوان لڑکا چل رہا تھا اور نیچے کے راستے سے ایک نوجوان لڑکی جا رہی تھی۔ اور ان دونوں راستوں پر دور دور تک اور کوئی نہیں تھا۔

نوجوان ایک لمحے کے لئے ٹھٹھکا۔ اس نے ایک تناور دیار سے لگ کے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور اپنے خاکی رنگ کے جھولے کو ٹھیک کیا اور پھر جھک کر

اس نے نیچے کے راستے پر نگاہ ڈالی ۔ لڑکی بغیر رُکے آگے جا رہی تھی۔

عبدل مُسکرایا۔ وہ سات کوس سے اکھٹے چلے آ رہے تھے۔ گو ان دونوں کے راستے الگ الگ تھے اور دونوں کے بیچ میں گھاٹی تھی اور دونوں ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے۔ پھر بھی عبدل کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ہمسفر ہیں اور ان دونوں کے درمیان ہمدردی کا وہ رشتہ ہونا چاہیئے۔ جو دو ہم سفروں کے درمیان ہوا کرتا ہے۔

مگر شائد وہ اکیلے سفر کرنے کی عادی تھی اس لیئے وہ اس رشتے کے نازک حسن کو پہچان نہ سکی۔ یہ سوچ کر عبدل کے فراخ ماتھے پر تیوری چڑھ گئی اور اس کا مضبوط جبڑا اوپر ابھر آیا۔

پھر وہ جیسے درگزر کرنے والے انداز سے مسکرایا اور اپنی خمیدہ ٹھوڑی کھجانے لگا۔ جس پر دو دن کے بالوں کی جڑیں ابھر آئی تھیں اس نے گردن پھیر کے لڑکی کی طرف دیکھا جو اب تھوڑی دور اور آگے نکل گئی تھی۔ یہ لڑکی اسے گو راہ کے تریب ... ملی تھی۔ پہلے راستے میں ایک گھر کے سامنے ایک عورت اسے رخصت کر رہی تھی۔ اور اس کی خوبصورتی دیکھ کے ٹھٹک گیا تھا۔ گو یہ گھاٹی اچھی خاصی اونچی تھی اور ان دونوں راستوں کے بیچ میں فاصلہ بھی کافی تھا۔ پھر بھی یہ گھاٹی اونچی نیچی ہوتی رہتی ہے اور پہاڑی راستے الگ الگ چلتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے اتنے قریب آجاتے ہیں کہ چند گزوں کا ہی فاصلہ رہتا ہے اور کبھی اتنے قریب آکے اتنے دور ہو جاتے ہیں کہ بیچ میں ہزاروں گز کا فاصلہ پڑ جاتا ہے، پہاڑی راستے جو ہوئے۔

یہ زندگی کا انداز پہچانتے ہیں۔ جب راستے دور سے آتے ہوئے ایک دوسرے

کے قریب ہوتے جاتے ہیں۔ قریب ہو کے مل جاتے ہیں اور بچھڑ جاتے ہیں۔

زندگی ـــــ عبدل نے سوچا۔ سیدھی سڑک نہیں ہے۔ پہاڑی راستہ ہے اور یہ راستہ گو راہ کے قریب وادی کے رستے سے اتنا قریب ہوگیا تھا۔ کہ اس نے اس لڑکی کے دلآویز خدوخال کو بڑے قریب سے دیکھ لیا تھا اور وہ وہیں ٹھٹھک کے رہ گیا۔ جس عمر میں وہ تھا اس عمر میں ہر نوجوان عورت حسین معلوم ہوتی ہے۔ جس وادی کا وہ رہنے والا تھا اس وادی کا حُسن ساری دنیا میں مشہور ہے پھر بھی ایسی رنگت، ایسا نکھار، ایسی صباحت، ایسی دلربائی اس نے شاید ہی دیکھی تھی۔ اک لمحے کے لئے اس کا سانس رک گیا تھا اور اس کے قدم رک گئے تھے۔ اور رستہ رک گیا تھا اور آسمان پر اڑتے ہوئے بادل رک گئے تھے کیونکہ جب خوبصورتی سامنے آتی ہے تو زندگی اک لمحے کے لئے رک کر اور جھک کر اسے خراج تحسین ادا کرتی ہے اور پھر آگے بڑھ جاتی ہے۔

عبدل بھی آگے بڑھ گیا اور اس نے گردن موڑتے موڑتے اسے دیکھ لیا۔ کہ نوجوان لڑکی سے گلے ملنے والی بڈھی عورت کی آنکھ میں آنسو جھلک رہے ہیں اور نوجوان لڑکی کا رُخ سورج کی تیز روشنی میں چمک رہا ہے۔

پھر عبدل نے دیکھا کہ لڑکی نچلے رستے پر اسی سمت چل رہی ہے جس سمت وہ جا رہا تھا اور گو ان دونوں رستوں کی سمتیں آخر میں الگ ہو جاتی تھیں اس کا رستہ شرق کو جاتے ہوئے شمال کی جانب مڑ جاتا تھا اور لڑکی کا رستہ جنوب کو مڑ جاتا تھا۔ لیکن یہ دسویں کوس کی بات تھی۔ دس کوس تک وہ دونوں ساتھ چلیں گے الگ الگ لیکن ساتھ ساتھ، سارے رستے میں دور دور تک اور کوئی مسافر نظر نہیں

آتا تھا۔ اس سے بھی عبدل کے دل میں ایک عجیب سی گدگدی پیدا ہوئی۔ اور وہ سوچنے لگا۔

جیسے اس میٹھی، مہربان، غنودگی سے لبریز وادی میں وہ دونوں ہی کے لئے بنائی ہے جیسے اب اس وادی میں ان دو مسافروں کے علاوہ اور کوئی نہیں آسکتا اور گو نچلے راستے پر اکثر مقامات پر آبادی آجاتی تھی گھر اور مویشی چرواہے اور کھیتوں میں کام کرنے والے کسان اور ان کے گھروں کی عورتیں جن سے لڑکی رک کر دو اک لمحے کے لئے ہنس کر بات بھی کر لیتی۔ لیکن یہ لوگ ان کی طرح مسافر نہیں تھے۔ یہ تو اپنے گاؤں، اپنے گھر اور اپنے کھیتوں میں کام کرنے والے لوگ تھے۔ یہ لوگ اپنی منزل پر تھکے مسافر نہیں تھے جو منزل کی تلاش میں آگے نکلتے جاتے ہیں۔ ان کے لئے عبدل کے دل میں رشک و رقابت کے جذبات بیدار نہیں ہوئے۔ لیکن وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ نچلے رستے پر کوئی دوسرا مسافر کسی رستے کے گاؤں سے نکل پڑے اور لڑکی کے ساتھ ساتھ چلنے لگ پڑے۔ یہ اسے کبھی گوارہ نہ ہوگا۔

ہر گاؤں کے قریب آتے ہی عبدل کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا اور جب وہ گاؤں پیچھے رہ جاتا اور لڑکی اکیلی اپنے راستے پر چلی جاتی تو اسے اطمینان سا ہو جاتا اور وہ پھر اپنے رستے پر آگے بڑھ جاتا۔ گوراہ سے اب تک سات کوس ہو چکے تھے۔ اور وہ دونوں اکیلے اکیلے اپنے رستے پر جا رہے تھے۔ اس امر سے عبدل بہت مطمئن تھا لیکن یہ سوچ کر بہت بے چین تھا کہ اب تلک اس نے لڑکی سے کوئی بات نہیں کی تھی ـــــ یہ بات نہیں تھی کہ شہری لڑکوں کی طرح اس

کے دل میں کسی قسم کی جھجک تھی۔ وہ گاؤں میں پلا بڑھا تھا۔ جہاں مرد اور عورتیں لڑکے اور لڑکیاں بے تکلفی سے ایک دوسرے سے بات چیت کر لیتے ہیں۔ لیکن پتہ نہیں یہاں کیا بات تھی کہ اس نے لڑکی سے بات کرنے کی کوشش کی۔ لیکن لڑکی نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ اس بات کا اُسے بڑا رنج اور غصہ تھا۔ پہلے تین چار کوس تو خیر مجبوری تھی کیونکہ گوراہ کے فوراً بعد ہی یہ دونوں راستے جو ایک دوسرے کے اس قدر قریب آ گئے تھے ایک دوسرے سے دور ہوتے گئے اور ان کے درمیان فاصلہ بڑھتا ہی گیا۔ حالانکہ وہ خود پہاڑ کی چوٹی کے قریب پہنچ گیا۔ یہاں اتنے دور سے تو کیا بات ہوتی ـــ ہاں چلّا کر ایک دوسرے کا نام ضرور پوچھا جا سکتا تھا ـــ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔

عبدل نے زور سے چلّا کر پوچھا

"او گیلے گیلے جلنے والئے کھواں جلی (او پگڈنڈی پگڈنڈی جانے والی لڑکی تو کہاں چلی)

عبدل کی آواز آس پاس کے پہاڑوں میں گونج گئی اور یہ گونج پلٹ کے قریب کے پہاڑوں سے اس کے پاس آتی گئی۔ پہاڑوں نے اپنے چوڑے چکلے سینوں کی گرجدار آواز سے بار بار پوچھا۔

او گیلے گیلے جلنے والئے کھواں جلی ـــ

نیچے وادی کی پگڈنڈی پر چلنے والی لڑکی چونک گئی اس نے آواز کے رُخ پر چاروں طرف دیکھا۔ کیونکہ یہ گونج چاروں طرف سے پیدا ہو رہی تھی۔ جیسے یہ چھوٹی سی وادی اور اس کے دیوتا خود لڑکی سے ہمکلام ہو رہے تھے۔ پھر

لڑکی کی نگاہیں گھاٹی کی چوٹی پر گھوم گئیں۔ جہاں سفید سفید بادلوں کے نیچے ایک لانبے قد کا نوجوان لڑکا کھڑا تھا۔ عبدل نے اپنا سوال پھر دُہرایا۔

لڑکی نے اس کی طرف دیکھ کر اپنا منہ پھیر لیا۔ جانے یہ اجنبی کون تھا وہ کیوں کسی کے سوال کا جواب دے اب تک وہ اپنے راستے پر دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ اب لڑکی کے قدم تیز تیز ہوتے گئے جسے دیکھ کر اب عبدل کو بھی اپنے قدم تیز کر دینے پڑے۔

عبدل لڑکی کے جواب نہ دینے پر چپ ہو گیا — اس کا رستہ بہت دُور تھا۔ اور وہ بے کار میں اتنی بلندی سے چلّا چلّا کے اپنے گلے کا ستیاناس نہیں کرنا چاہتا تھا۔

وہ چپکے سے اپنے راستے پر چلتا گیا۔ اگلے کوس کے بعد اس کا راستہ نیچے ڈھلوان کو جانے لگا۔ یعنی لڑکی کے راستے کے قریب ہونے لگا۔ قریب ہوتے ہوتے یہاں تک قریب ہوا کہ اب وہ لڑکی کے رُخ پر لہراتی ہوئی زُلف کو دیکھ سکتا تھا۔ اس کی سُرخ سوسی کی قمیض اور شلوار پر چھینٹ کے سفید پھولوں کو دیکھ سکتا تھا۔ اس کی چھاتیوں کے زیر و بم کی دھمک کو محسوس کر سکتا تھا۔ لڑکی کو معلوم تھا کہ اب وہ اس کے قریب اوپر گھاٹی کے رستے پر چل رہا تھا لیکن وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔

وہ کیوں دیکھے — کسی اجنبی کی طرف کیوں دیکھے — کیوں کسی سے بات کرے —!

لڑکی کے قدم تیز ہوتے گئے۔ عبدل نے مسکرا کر اپنے پاؤں کی ایک ہلکی سی

ٹھوکر سے ایک چھوٹا سا پتھر نیچے لڑھکا دیا۔ پتھر سبزے پر لڑھکتا ہوا چیل کے ایک تنے سے ٹکرایا اور وہاں سے اچھل کر نیچے پگڈنڈی پر لڑکی کے سامنے آن پڑا ۔۔ لڑکی ٹھٹک گئی۔

اس نے غصّہ کی نگاہوں سے عبدل کو دیکھا ۔۔۔ عبدل مسکرایا ۔۔۔ لڑکی نے منہ پھیر لیا۔ عبدل نے ایک اور پتھر لڑھکایا ۔۔۔ لڑکی چھلانگ مار کے آگے بڑھ گئی اور اپنے راستے پر دوڑنے لگی۔

عبدل ہنسنے لگا۔ سُرخ شلوار، سُرخ قمیض اور گلابی چہرہ ۔۔۔ عبدل تک بندی کرتے ہوئے گانے لگا۔

سُرخ پھُول گلاب دا چلدا گھیلے گیلے
رُسیا رُسیا ٹُر دا چلدا بہیلے بہیلے

(سرخ پھول گلاب کا پگڈنڈی پر چل رہا ہے ۔۔ رُوٹھا رُوٹھا چل رہا ہے جلدی جلدی ......)

لڑکی نے گھوم کے عبدل کی طرف دیکھا اور جھنجھلا کے ایک پتھر کھینچ کر مارا، عبدل فوراً جھاڑی کے پیچھے چھپ گیا۔ پتھر چیل کے ایک تنے سے ٹکرا کے واپس نیچے پگڈنڈی پر جا گرا۔ عبدل جھاڑی کے پیچھے سے نکلا ہنستا ہوا، قہقہے لگاتا ہوا۔ گاتا ہوا۔

پتھر مار کے چنّا رُس جانا

اس کی آواز دور ہوتی گئی۔ کیونکہ اس کا راستہ پھر اوپر جا رہا تھا۔ عبدل نے سوچا ۔۔۔ کتنی بدمزاج لڑکی ہے ۔ نہ گانا جانتی ہے۔ نہ باتیں کرنا،

سفر میں اگر آدمی باتیں کرتا جائے یا اپنے رفیق کے گانے کے بولوں کا جواب دیتا جائے۔ تو سفر کتنے مزے سے کٹ جاتا ہے شائد یہ لڑکی پہلی بار گھر سے کہیں باہر جا رہی ہے۔

شائد بہت مغرور ہو گی ـــ اور مغرور ہونے کی وجہ تو سمجھ میں آتی ہے۔

عبدل نے سوچا ـــ پھر اس نے سوچا ـــ مگر ایسا بھی کیا۔ سات کوس تک وہ دونوں اکٹھے آمنے سامنے چلتے رہے اور وہ منہ سے ایک لفظ تک نہ کہہ سکی۔ آخر ہم بھی انسان کی اولاد ہیں، کوئی وحشی نہیں ہیں۔

عبدل نے جھوے کو ٹھیک کر کے آگے دیکھا۔ تو لڑکی بہت آگے نکل چکی تھی اس نے درخت کے تنے کا سہارا چھوڑ دیا اور اپنے رستے پر ہو لیا۔

اگلے دو کوس تک عبدل نے کسی قسم کی کوئی کوشش نہ کی۔ وہ چپ چاپ اپنے رستے پر چلتا رہا۔ ان دو کوسوں میں اس کا رستہ کئی بار نیچے آیا، اوپر گیا ـــ پھر نیچے آیا۔ لیکن وہ اپنی راہ پر چلتا رہا۔ ایک بار تو وہ دونوں رستوں میں صرف چند گز ہی کا فاصلہ رہ گیا۔ پھر بھی عبدل نے لڑکی کی طرف دیکھنے یا اس سے بات کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

وہ خاموشی سے اپنے رستے پر چلتا گیا۔

دو کوس گزر گئے ـــ اب یہ آخری کوس تھا ـــ ساتھ ساتھ چلنے والی دونوں پگڈنڈیاں اس کوس کے آخری قدموں پر ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے۔ ایک شمال کو جائے گی۔ اور دوسری جنوب کو جائے گی۔ عبدل کے دل میں ایک عجیب بے کلی پیدا ہو گئی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اپنے برسوں

کے جانے پہچانے ہم سفر سے الگ ہو رہا ہو۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اور جوں جوں وہ منزل قریب آتی گئی۔ اس کے قدم سست پڑتے گئے۔

لڑکی کے چلنے کی رفتار بھی دھیمی پڑ گئی تھی۔ پچھلے دو کوسوں میں اس نے کئی بار کنکھیوں سے عبدل کو دیکھا تھا اور عبدل کو خاموش اور اداس پاکر اس کے دل کو بھی ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ کہیں کوئی بجلی کی رو دوڑتی ہوئی آتی تھی اور اس کے جسم کا ذرّہ ذرّہ اس کے حدّت آمیز لمس سے سنسنا اٹھتا تھا

یکایک وہ اپنے رویں رویں میں بیدار ہو گئی ـــــ اور لہو کا طوفان اس کی رگوں میں ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ اور اس کی آہستہ خرامی کا وجد آمیز لوچ اک گہری اُداس تھکن میں کھو گیا۔ اس نے پہلی بار کیسے عجیب حسرت آمیز انداز سے عبدل کو دیکھا۔

عبدل رک گیا۔

لڑکی بھی رک گئی۔

دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔

پھر لڑکی کی گہری پلکیں آہستہ سے اس کے رخساروں پر جھک گئیں جیسے شفاف چشمے کے اوپر بادلوں کا سایہ آجائے۔ عبدل نے گھبرا کے منہ پھیر لیا اور شمال کی جانب مڑ گیا۔ لڑکی وہیں پتھر پر بیٹھی تھی۔

عبدل کا رستہ شمال کو جاتا تھا۔ شمال کو جہاں اخروٹ کے درختوں میں شہد کے چھتے لگے ہیں اور جھاڑیوں پر سُرخ گریچ چوک رہے ہیں۔ شمال کو جہاں دیار کے تناور درخت سپاہیوں کی طرح افق پر پہرہ دیتے ہیں اور آسمان پر شفاف بادل

اونچے اونچے قلعے بناتے ہیں، شمال کو جہاں برفیلی ہوائیں تیز و تند جھکڑ اور آندھیاں لئے اڑتی ہیں اور کاغان کے کنارے وہ چنار کھڑا ہے جہاں آج سے کئی سو سال پہلے جہانگیر اور نورجہاں نے محبت کی امنگ دیکھی تھی۔

عبدل کا رستہ شمال کو جاتا تھا ـــــ جہاں اس کا گھر تھا۔

لڑکی وہیں پتھر پر بیٹھی تھی۔

عبدل شمال کو جا رہا تھا۔ اور اس کے گلے میں ایک رسّی تھی جو اسے پیچھے کھینچ رہی تھی اور اس کے پاؤں میں ایک ایک من کے پتھر بندھے تھے اور زمین تلے ایسا مقناطیس لگا تھا جو اسے آگے بڑھنے سے روک رہا تھا۔ پھر بھی عبدل گھاٹی کے اوپر چڑھتا گیا۔

لڑکی بہت دیر تک چپ چاپ پتھر پر بیٹھی رہی۔ جب عبدل درخت کے گھنے جھنڈ میں غائب ہو گیا تو وہ وہاں سے اٹھی اور ہوئے ہوئے قدموں سے اپنے راستے پر چلنے لگی۔

اب دوپہر ڈھل رہی تھی ـــــ کوئی دو کوس کا فاصلہ اور ہو گا اور پھر وہ اپنے باپ کے پاس پہنچ جائے گی جو رنگرا کے اگلے جنگل میں لکڑیاں چیرنے کا کام کرتا تھا۔ جب وہ گوارہ سے چلی تو کتنی خوش تھی۔

اس کی ماں نے اپنے خاوند کے لئے اپنی بیٹی کے ہاتھ گڑ بھیجا تھا اور چائے اور نمک اور سوڈا اور ایک چابی کے لمبے کی قمیض۔ اس کا باپ اس قمیض کو پہن کے کتنا خوش ہو گا۔" لڑکی نے اپنی چادر کے کنارے سے بندھی ہوئی چیزوں کو اپنے ہاتھ سے چھوا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ

بھی آئی ۔لیکن ابھی اس کے چہرے پر ایک مسرت آمیز غلش اور پریشانی سی باقی تھی جس نے اس کی مسکراہٹ کو اچھی طرح کھلنے نہیں دیا تھا۔ وہ اچھی طرح سے سمجھ بھی نہ سکی تھی کہ وہ کیوں اس نوجوان کو اپنے راستے پر جاتے ہوئے دیکھ کر اداس ہوگئی۔

وہ اپنے گھر جا رہا ہوگا — جیسے وہ اپنے باپ سے ملنے جا رہی تھی۔ پھر وہ کیوں اداس ہوگئی۔ کیوں اسے دیکھ کر ایسا ہوا جیسے اس کے تن بدن کے روئیں روئیں میں بھنور سے پڑنے لگے۔ یہ گرداب کیسے ہوتے ہیں جب سارا بدن ٹوٹنے لگتا ہے۔ اور ہاتھ پاؤں ایسے ڈھیلے ہو جاتے ہیں کہ رستے پر چلنا دوبھر ہو جاتا ہے۔ جب وہ چھوٹی سی تھی۔ تب تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔

اب ..... اور اب ..... وہ نوجوان اس کے ساتھ ساتھ پیچھے کیوں نہیں آیا — اسے ایسا معلوم ہوا جیسے اس کی زندگی میں اس کے جسم میں اس کی روح میں کہیں کوئی کمی رہ گئی ہے۔ نا اکملیت کا احساس۔

یکایک لڑکی نے پیچھے مڑ کے دیکھا دور سے عبدل چلا آرہا تھا۔ اس کے رستے پر، اپنا رستہ چھوڑ کے۔ اس کے رستے پر —!

لڑکی کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کے دل کے خوابیدہ خوف جاگ اٹھے خوف بھی اور خوشی بھی — آرزوؤں کی کونپلیں اور اُمنگوں کے مرغزار، ننھے ننھے پھول، یہ ہری بھری کیاریاں کیا سب اس کے دل میں کسی بے نام سے گزند کا خیال سانپ کے پھن کی طرح لہرانے لگا۔ اور وہ تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔

لیکن عبدل آہستہ آہستہ سر جھکائے اس کے پیچھے آرہا تھا۔ وہ چاہتا تو دوڑ

کے اسے پکڑ سکتا تھا۔ لیکن اس نے اسے پکڑا نہیں۔ گو اسے قدم بار بار آگے کھینچ کے لے جاتے تھے۔ لیکن وہ انہیں روک کے آہستہ آہستہ لڑکی اور بیچ میں کافی فاصلہ رکھ کے چل رہا تھا یہ لڑکی اسے شمال سے جنوب کو کھینچ لائی تھی اس طرح کہ اب اسے اپنے گھر کا سفر بے کار معلوم ہو رہا تھا۔

بالکل بے مصرف ــــ جیسے کوئی دن سے سورج اور رات سے اس کے تارے چھین لے۔ وہ بالکل اسی طرح محسوس کر رہا تھا اسی لئے تو شمال سے جنوب کو پلٹ آیا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ سفر کہاں ختم ہوتا ہے یہ ایک قدم اسے کہاں لے جاتے ہیں ــــ یہ سرخ پھول کس وادی میں کھلتا ہے ....

وہ لڑکی کے پیچھے پیچھے چلتا رہا ــــ لڑکی آگے بڑھتی گئی ــــ کیونکہ رستہ اسے معلوم تھا لیکن کیا یہ وہی رستہ تھا۔ کیا یہ نیا رستہ نہیں تھا۔ لڑکی کی نگاہوں میں ہر چیز نئی معلوم ہو رہی تھی۔ پگڈنڈی کے کنارے کے جنگلی پھولوں نے اس طرح حیرت سے آنکھیں کھول کر اس کی طرف یوں نہ دیکھا تھا۔ پیڑوں کی گداز شاخیں شفقت آمیز انداز میں اس پر جھکتی جارہی تھیں اور اس کی مہکتی ہوئی ہواؤں میں میٹھی میٹھی سرگوشیاں تھیں اور اب تو پاؤں کے نیچے آنے والے چھوٹے چھوٹے نیلے پتھر اس کے تلوؤں کو گدگدا کر الگ ہو جاتے۔ شریر پتھر، اس کا جی یکایک ناچنے کو چاہنے لگا۔ مگر وہ اپنی خواہش کو دل ہی دل میں دبا کر آگے بڑھ گئی۔

اب زنگڑ کا جنگل شروع ہو گیا۔ جہاں اس کا باپ کام کرتا تھا یہاں سے پگڈنڈی وادی کے پہلو کو چھوڑ کر اوپر جاتی تھی راستے میں جگہ جگہ درخت گرے پڑے

تھے، اور کٹی ہوئی جڑوں کے سُرخ ٹھنٹھ نمایاں نظر آتے تھے۔ کہیں پر آدھے چھلے ہوئے تنے تھے۔ کہیں پر بڑی بڑی گیلیاں اور شہتیر اور چھوٹی چھوٹی سی شہتیریاں،

لڑکی نے مڑ کر عبدل کی طرف دیکھا۔ دوسرے لمحے وہ گھاٹی کے اوپر چڑھتی گئی۔ عبدل دیر تک نیچے کھڑا رہا۔ جب وہ کافی دور تک اوپر چلی گئی تو وہ اپنی جگہ سے ہلا۔ اوپر چڑھتے چڑھتے لڑکی گھاٹی کی چوٹی کے گھنے جنگل میں غائب ہو گئی اور عبدل ایک لمحہ کے لئے پریشان سا ہو گیا پھر وہ سمت دیکھ کر جدھر لڑکی غائب ہو گئی تھی۔ ادھر مڑ گیا۔ لیکن ابھی اسے کافی فاصلہ طے کرنا تھا۔

گھاٹی کے اوپر چڑھ کے اس نے دیکھا تو لڑکی اسے کہیں نظر نہ آئی سامنے گھنے جنگل کے بیچ میں بہت سے گھنے درختوں کو گرا کر جگہ صاف کی گئی تھی۔ یہاں ایک میٹالے رنگ کا خیمہ تنا تھا اور ایک جھونپڑی چھتی تھی۔ چار آدمی ایک بڑے آرے پر کام کرتے ہوئے چیل کے ایک تنے کو چیر رہے تھے ان کے آگے مشرق کی طرف ڈھلوان تھی۔ جہاں شہتیروں کو ایک دوسرے کے نیچے ڈال کے لکڑیوں کی گھیلی بنائی گئی تھی۔

یہ نیل نما گھیل ترچھے انداز میں گھومتی ہوئی گھاٹی کی دوسری جانب نیچے ندی میں چلی گئی تھی ـــــ کاغان کی ندی جس کا شفاف پانی اپنی رنگت اور پاکیزگی میں آسمان کو بھی شرماتا تھا۔

لیکن لڑکی کہیں نظر نہ آئی۔

عبدل آگے بڑھ آیا۔ مزدوروں نے آرے پر کام کرنا چھوڑ دیا اور اس کی

طرف غور سے دیکھنے لگے۔ عبدل نے ایک لمحہ کے لئے اپنا دایاں پاؤں اپنے بائیں پاؤں سے کھجایا اور پھر مسکراتے ہوئے آگے بڑھ آیا۔

ایک پستہ قد کا چوڑا چکلا آدمی جس کے سینے پر سرخ بال تھے جس کا سر گھٹا ہوا تھا اور جس کی آنکھیں گہری نیلی تھیں۔ دو قدم آگے بڑھا۔ اُس کے دونوں ہاتھ کولہوں پر تھے اور اس نے عبدل کو سر سے پاؤں تک گھورا۔ پھر بولا۔

"شہر سے آئے ہو۔"

عبدل نے اثبات میں سر ہلا دیا

"تمہیں لالہ گیان شاہ ٹھیکیدار نے بھیجا ہے یہاں۔

عبدل نے انکار میں سر ہلا دیا۔

موٹے تازے پستہ قد آدمی نے پہلی بار اطمینان کا سانس لیا۔ مسکرا کے بولا۔ تو ادھر جنگل میں کیا کام کرنے آئے ہو۔ شہد کے چھتے توڑنے آئے ہو جنگلی ریچھوں کی طرح۔

وہ ہنسا اور اس کے ساتھ اس کے تینوں ساتھی بھی ہنسے۔ ایک جس کا قد لمبا تھا اور جس کے سر پر گول اور بھوری ٹوپی تھی۔ ایک وہ جو بہت دُبلا تھا، اور جس کے ہاتھوں کی انگلیاں بڑی لمبی تھیں اور جو ایک خاکی نیکر اور پھٹی ہوئی قمیض پہنے تھا اور ایک وہ جو ذات کا گوجر دکھائی دیتا تھا جو سانولے رنگ کا تھا اور جس کے بڑے بڑے دانت تھے اور کاسنی رنگ کے مسوڑھے اور جس کی ہنسی سب سے زیادہ اونچی تھی۔

عبدل بھی اس کی ہنسی میں شریک ہوگیا۔ پھر عبدل نے کہا۔
وہ راستہ بھول گیا ہے ـــــ وہ دراصل کاغان جارہا تھا۔ مگر رستہ بھول کے ادھر چلا آیا۔

پستہ قد کا مضبوط آدمی پھر زور سے ہنسا اور اس نے بلند آواز میں کہا۔ "کاغان تو ادھر ہے ـــــ" اور دائیں ہاتھ سے دوسری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اور تم ادھر آگئے۔"

عبدل نے کہا۔ "غلطی ہوئی۔ چار سال کے بعد شہر سے آرہا ہوں۔ اسی لئے راستہ بھول گیا۔

"تو آج یہیں رہو ـــــ آج تم واپس نہیں جاسکتے اب سہ پہر بھی ڈھل رہی ہے واپس جاتے تمہیں رات پڑ جائے گی اور تم مشکل سے سرکاری رکھ تک پہنچ سکو گے اور رات کے وقت کوئی آدمی کا بچہ اس رکھ کو پار نہیں کرسکتا۔"

چیتے اور ریچھ اور بھیڑیئے ..... جانتے ہو۔"

عبدل بولا ـــــ "یہ تو ٹھیک ہے۔"

عین اسی وقت اس نے لڑکی کو جھونپڑے میں کھڑے دیکھا۔

۲

سہ پہر کے آخری لمحے تھے جب عبدل چونک کے جاگا۔ وہ وہیں زمین پر لکڑی کے ٹھنڈے بُرادے کے ڈھیر پر سو گیا تھا۔ ایسے اطمینان سے جیسے

وہ اپنے گھر بستر پر سو رہا ہو۔ اور جب وہ جاگا۔ تو سورج کی آخری کرنیں جنگل کے بیچ میں اس کھلی جگہ پر پڑ رہی تھیں۔ جہاں ابھی آرا چل رہا تھا۔ کاؤ کی مضبوط صلیب نما کھپنچیوں کے درمیان دیودار کی ایک مضبوط گیلی ترچھی کھڑی تھی ایک صلیب اوپر تھی، ایک نیچے، آرے کا ایک سرا اوپر تھا ایک نیچے۔ اوپر کی صلیب پر شہتیر قد کا مضبوط کشمیری کھڑا تھا۔ اور اس کے ساتھ میں وہ سانولے رنگ کا گوجر تھا۔

دوسری صلیب کے نیچے وہ لمبا تڑنگا گول ٹوپی والا آدمی تھا اور اس کے ساتھ میں لمبی انگلیوں والا دبلا پتلا مزدور جس کی قمیض جگہ جگہ سے پھٹ چکی تھی ہلا کی آواز سے آرا اوپر جاتا اور ہو کی آواز سے آرا نیچے آتا اور اس ہلا اور ہو کی لے پر دیودار کی گیلی کو آرا چیر رہا تھا اور ہلکا ہلکا برادہ نیچے گرتا جا رہا تھا۔ چاروں طرف دیودار، دیار۔ چیل۔ ریاڑ۔ کاؤ اور تنگ کے درخت کھڑے تھے۔

سورج کی آخری کرنیں چیل کے جھونپڑوں اور دیودار کے جھتناروں سے چھن چھن کر فرش زمین پر گر رہی تھیں اور لکڑی کا برادہ سونے کے ذروں کی طرح چمک رہا تھا یہ چمک تیز چلتے ہوئے آرے پر تھی۔ دیودار کی گیلی پر تھی جس کے سینے سے سونے کا غبار چھن رہا تھا۔ مزدوروں کے ایک مخصوص لے پر حرکت کرتے ہوئے ہاتھوں میں تھی اور ان کی باہوں کی ابھری ہوئی مچھلیوں کی گردش اور مضبوط پنڈلیوں کی نسوں کی ہر تان میں اور گرم سانسوں سے ڈولتی ہوئی۔ چھاتیوں کی ہر گردش میں ایک ایسے رچے ہوئے آہنگ کی پکار تھی جیسے وہ

اپنے ہاتھ میں لوہے کا آرا ہنیں محنت کا نشانہ لئے گا رہے تھے

عبدل ایک عرصہ تک محویت کے عالم میں اس منظر کو دیکھتا رہا پھر جب سورج کی آخری کرنیں پستہ قد کشمیری کے ماتھے کو چھو کر اوپر درخت کی ڈالیوں میں پھیل گئیں تو مزدوروں نے آرا چلانا بند کر دیا۔ اور اپنا پسینہ پونچھتے ہوئے عبدل کے پاس لکڑی کے بُرادے کے ڈھیر کے قریب آبیٹھے۔

پستہ قد کشمیری نے اس سے پوچھا۔

"تم شہر میں کیا کام کرتے ہو۔؟"

"اسکول میں پڑھتا ہوں"

"ہوں ـــــ تمہارا نام کیا ہے؟"

"عبدل ـــــ"

"کتنی جماعت میں پڑھتے ہو۔"

"آٹھ ـــــ"

"آٹھ ـــــ؟"

"تو انگریزی بھی پڑھتے ہو گے"

"ہاں ـــــ"

مزدوروں نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں صلاح ومشورہ کیا۔ آخر لانبے قد والے آدمی نے جس کا نام بعد میں عبدل کو ولی محمد معلوم ہوا۔ پستہ قد آدمی سے کہا۔ "دکھا دے نا در۔ اس میں حرج ہی کیا ہے کیوں کریم داد تمہاری کیا صلاح ہے"

کرم داد جو سانولے رنگ کا گوجر تھا بولا
"ٹھیک تو ہے پتہ چل جائے گا۔ نورے کی بھی صلاح لے لو۔"
یہ دبلے پتلے لانبی انگلیوں والے آدمی کی طرف اشارہ تھا۔ وہ اکڑوں بیٹھا تھا اور اپنی لانبی انگلیوں سے ٹھوڑی کو سہلا رہا تھا اور عبدل کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا اس نے آدھے شبہے اور آدھے یقین کے انداز میں دیکھا۔

"اچھا تو دکھا دو۔۔۔"

جب نورے، کرم داد اور دلی جو کی صلاح ایک معلوم ہوئی تو پستہ قد قادر بٹ نے اپنی میلی کچیلی قمیض کی جیب سے ایک کاغذ نکالا جو کئی تہوں میں بند تھا۔ کاغذ کبھی سفید رنگ کا ہوگا۔ لیکن متواتر جیب میں پڑے رہنے سے بھورے رنگ کا ہو گیا تھا۔ اور تہوں کے قریب سے پھٹتا جا رہا تھا۔

قادر بٹ نے وہ کاغذ بڑی احتیاط سے نکال کے عبدل کے ہاتھ میں دے دیا اور کہا۔۔۔"اسے پڑھو۔۔۔"

عبدل بھورے رنگ کے کاغذ کی تہیں کھولنے لگا۔ اس کاغذ سے آدمی کے پسینے اور لکڑی کے برادے کی بُو آ رہی تھی۔ تہ در تہ کھولنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ کاغذ ریاست کے وزیر صاحب کے دفتر سے لالہ گیان شاہ ٹھیکیدار جنگلات کے نام جاری کیا گیا ہے جس میں منجملہ دوسری باتوں کے لکھا تھا کہ لکڑی کی کٹائی کرنے والے مزدوروں اور آرا چلانے والے مزدوروں اور لکڑی کی گھسیل پر کام کرنے والے مزدوروں کو آٹھ آنے یومیہ کے حساب سے اجرت دی جائے گی۔

"سور کا بچہ" قادر زور سے چیخا اور وہ زور زور سے اپنی چھاتی کوٹنے لگا۔ سور کا بچہ یہاں آیا اور زندہ واپس چلا گیا۔

دبلے پتلے آدمی کی بھی انگلیاں بڑی بے چینی سے اپنی ٹھوڑی کو چھو رہی تھیں۔

عبدل نے پوچھا۔ "کیا بات ہے"

"کیا بات ہے" لانبے قد کا دلی جو بولا ــــ وہ بہت غصے میں معلوم ہوتا تھا لالہ گیان شاہ کا سالا ہم کو کچھ آنے مزدوری دیتا ہے اور ادھر سرکاری پرچے (اس نے بھورے کاغذ کو تھپتھپایا) پر لکھا ہے ہم کو آٹھ آنے مزدوری ملنا چاہیئے "ہائے ہائے ــــ" قادر بٹ نے جھلا کے کہا۔ وہ سالا لالہ گیان شاہ اور اس کا آدمی ادھر آیا بھی اور زندہ چلا گیا۔

عبدل نے پوچھا۔

"نہیں یہ کاغذ کب ملا ــــ"

"ارے ہمیں کون دیتا تھا ــــ" نورے نے غصے میں کہا اور اس کی آنکھیں سبز دکھائی دینے لگیں بلی کی طرح ــــ "یہ کاغذ تو لالہ کے آدمی دھرم چند کی جیب سے گر پڑا تھا" اتنا کہہ کر نورے نے بڑے غصہ سے کاغذ کو تھپتھپایا۔

قادر نے کہا۔ "ارے کیا کرتے ہو کاغذ پھٹ جائے گا" اس نے عبدل کے ہاتھ سے کاغذ لے لیا اور بڑی احتیاط سے اُسے طے کرنے لگا۔

کرم داد بولا ــــ "اب یہ کاغذ کس کام کا۔ لالہ تین مہینے کی مزدوری دے گیا اور رسید بھی لے گیا۔

قادر بولا۔ ابھی تین مہینے کا کام باقی ہے اس کے باپ سے بھی اپنی مجوری نہیں چھوڑیں گے۔ یہ سرکاری کاگیج جو ہے ، قادر نے اتنا کہہ کے کاغذ بڑے اطمینان سے جیب میں رکھ لیا۔

عبدل نے پوچھا۔ "تم نے رسید دیکھی تھی؟ اگر اس نے اس پہ آٹھ آنے کے حساب سے مجوری لکھوائی ہو تو۔

تو اس کی بے ایمانی کو کیا کریںگے۔ اپنا اپنا مقدر ہے ہم نے تو انگوٹھا لگا دیا تھا ہم کوئی الکھشر تھوڑے ہی پڑھے ہیں تیری طرح" دلی جو نے چمک کے کہا۔

قادر بٹ نے اپنے سینے پر ہاتھ مار کر کہا " روتا کیوں ہے۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ اب کے لالہ کو آنے دے۔"

وہ سب چپ ہو گئے

کرم داد بولا —— ، تھوڑی گٹھلیاں رہ گئی ہیں انہیں ڈھال پر اتار دیں"

نورا بولا —— "مرتا کیوں ہے۔ صبح دیکھا جائے گا۔"

قادر بولا۔" نہیں کام تو ٹھیک ہو گا اور پھر ابھی کھانے میں دیر ہے۔ چائے پی کے یہ گٹھلیاں بھی نیچے پھینک دیتے ہیں۔ اس میں رکھا کیا ہے۔"

اتنا کہہ کے اس نے آواز دی۔

" بانو —— بانو —— "

عبدل نے دیکھا کہ وہ لڑکی جھونپڑے کے سامنے کھڑی ہے۔ اور کہہ رہی ہے جی ابا ——!

"چائے"

"ہاں ابّا۔ لاتی ہوں ابھی۔

قادر نے خوشی سے اپنے ہاتھ ملے اور اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں کی تیلیوں کو گھما کر بولا۔ "میری بیٹی گاؤں سے بڑی اچھی چائے لاتی ہے کشمیری چائے اور نمک اور گڑ۔ آج مدت کے بعد چائے پینے کا مزا آئے گا۔"

تھوڑی دیر کے بعد بانو سب کے لئے باری باری سے مٹی کی رکابیوں میں چائے لائی۔ چائے پہلے مہمان کو پیش کی گئی پھر قادر ابّا کو ـــــ پھر دوسرے ساتھیوں کو۔ عبدل نے پہلے ہی گھونٹ میں محسوس کیا کہ چائے بڑی مزیدار ہے۔ کشمیری چائے جس میں نمک گڑ اور سوڈا پڑتا ہے۔ جو قہوے کی طرح گرم ہو جاتی ہے اور گلاب کی طرح سُرخ ـــــ اس کا مزہ سب سے الگ رہتا ہے۔

قادر بڑے مزے سے سڑوکے لگا لگا کے پینے لگا اور ہر گھونٹ کے بعد خوشی کا اظہار کرتا۔

چائے پینے کے بعد وہ لوگ ڈھال پر چلے گئے۔ عبدل بھی ان کے ساتھ چلا گیا۔ جھونپڑی کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھا کہ بانو چولہے میں مکّی کے سوڑے سینک رہی ہے۔ چولہے پر جھکی ہوئی بانو نے اسے ایک لمحہ کے لئے کنکھیوں سے دیکھا۔

وہ گلاب سے رخسار اب شعلہ تھے اور اس پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں ـــــ عبدل آگے بڑھ گیا۔

ڈھال بہت لمبی تھی۔ گھاٹی کی چوٹی سے جہاں وہ کھڑے تھے نیچے کا غان

کی ندی کے کنارے تک ڈھلوان کے ساتھ ساتھ لکڑیوں کی ڈھال بنی ہوئی تھی یہ ڈھال سینکڑوں چھوٹی چھوٹی شہتیریوں کو ایک دوسرے کے ساتھ اوپر نیچے رکھ کے بنائی گئی تھی۔

اس فیل نما ڈھال کے کنارے بڑی بڑی گہلیاں رکھی ہوئی تھیں تاکہ نیچے گراتے ہوئے کوئی شہتیری ڈھال کے اِدھر اُدھر اچھل کر نہ گر سکے۔

"ہلا — ہو — شیرا —" قادر نے بلند آواز سے کہا۔ اور اسی لمحے لکڑی کے ایک بڑے شہتیر کو ڈھال سے نیچے لڑھکا دیا۔ شہتیر فیل نما ڈھال پر پھسلتا ہوا بڑی تیزی سے نیچے گرتا گیا۔

ڈھلان کے ہر موڑ پر جب وہ اوپر کی ڈھال سے نیچے کی ڈھال پر گرتا۔ تو ایک بلند آواز پیدا ہوتی ہے۔ شہتیر ڈھال پر پھسلتا ہوا چند لمحوں میں ندی کے کنارے سے اچھل کر پانی میں گر جاتا۔ اور دھم کی آواز سے پانی اوپر اچھلتا اور لہریں دور دور تک پھیل جاتیں۔

ہلا ہو شیرا۔ کہہ کے وہ لوگ گہلیاں اور شہتیر اور شہتیریاں نیچے لڑھکانے لگے۔ عبدل بھی ان کے ساتھ شریک ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اندھیرا اتنا بڑھ گیا کہ اب ڈھال کے کنارے اور ندی کی سطح بھی نظر نہیں آتی تھی۔ صرف لکڑی کے ڈھال پر گرنے اور گونج کر نیچے گرتے جانے اور پھر پانی میں دھم سے گرنے کی آواز آتی تھی تھوڑی دیر کے بعد آخری گہیلی بھی نیچے لڑھکا دی گئی اور مزدور اپنے جھونپڑے کو لوٹے۔

مکئی کی روٹی اور پیاز کی چٹنی کھا کے اور ٹھنڈا پانی پی کے سب نے

اطمینان کا سانس لیا۔

نورے اور کرم داد نے جنگل کے بیچ کی کھلی جگہ کے چاروں طرف لکڑیاں پھیلا کے آگ سلگا دی تاکہ جنگلی جانور ڈر کر ادھر نہ آئیں پھر وہ لوگ اکھٹے ہو کے آرے کے نیچے بیٹھ گئے۔ جھونپڑے میں بانو سب کو کھلا کے اب خود کھا رہی تھی۔

نادر نے لمبی جماہی لے کے کہا۔

" مجھے تو اب نیند آرہی ہے۔ میں تو اب خیمے میں چل کے سوتا ہوں"

وہ اٹھ کے چلا گیا

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر کرم داد نے پوچھا

" عبدل تم کتنے بہن بھائی ہو ـــــ"

عبدل بولا

" ہم دو بھائی ہیں ـــــ ایک بہن ہے"

نورا بولا

" اور تمہاری شادی ـــــ"

" ابھی نہیں ہوئی ـ"

" ارے اتنے بڑے ہو گئے۔ اور ابھی تک شادی نہیں کی ـــــ

ولی جو بڑی حیرت سے کہنے لگا۔ ہمارے گاؤں میں تو بڑی جلدی جوان کی شادی کر دیتے ہیں۔

کرم داد نے نورے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"نورے سے پوچھو۔"

نورے نے ایک آہ بھر کے کہا۔

"ارے یار کیا پوچھتے ہو۔ بیوی بہت یاد آتی ہے۔ تین مہینے سے اکیلے اس جنگل میں پڑے ہیں"

سب چپ ہو گئے۔

دلی جو نے بڑی دیر کے بعد کہا ——— "میں بھی خیمے میں جا کے سوتا ہوں۔ اور تم کرم داد ———"

"میں تو چاند نکلنے تک یہاں بیٹھوں گا ———"

کرم داد نے کہا

"میں بھی ———"

نورا ایک آہ بھر کے بولا

عبدل نے مسکرا کے کہا۔

"میں بھی بیٹھوں۔"

"ہاں ہاں۔ تمہیں کون سا پار جانا ہے کا غان ہی تو جانا ہے"

نورا نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ہولے ہولے گانے لگا۔

جنگل کی وحشی محبت کا گیت

اک گلہری تھی ایک سانپ تھا۔

ایک بنفشے کا پھول تھا۔

ایک لکڑی چیرنے والا تھا۔ ایک اس کے دل کی رانی تھی۔

محبت کی رات تھی۔
محبت کی رات تھی، جب چاند نکلا
چاند عاشقوں کی زبان ہے
گلہری نے لکڑی چیرنے والے کے ناخن کاٹ لیئے۔ سانپ نے رانی کو زہر دے دیا۔
بنفشے کے پھول نے اپنی آنکھیں بند کرلیں
لکڑی چیرنے والا پاگل ہوکے بھاگا آہ ! آہ ! آہ
لکڑی چیرنے والا پاگل ہوکے بھاگا آہ ! آہ ! آہ
سانپ نے پھن پھیلایا ـــــ گلہری نے قبر کھودی
رانی سوگئی۔ بنفشے کے پھول کی گود میں
بنفشے کے پھول کی گود میں۔
چاند ڈوب گیا۔
آخر میں لورے کی آواز بالکل ڈوب سی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ خراٹے لینے لگا۔

عبدل نے دیکھا اس کے قریب ہی کرم داد بھی سوگیا تھا۔ دونوں چاند کا انتظار کرنے والے اس کے آنے سے پہلے ہی سوگئے تھے۔ دن بھر کی محنت سے تھکے ہوئے اپنے دور گاؤں میں بسنے والی بیویوں اور بچوں کے سنہری تصور لیئے ہوئے سو گئے تھے۔ اور ان کے سوجانے کے بعد چاند اس کھلی جگہ پر آیا اور خیمے اور جھونپڑیاں اور آرے اور لکڑی کے بُرادے کے ڈھیر پر دودھ جیسی بے داغ چاندنی سیال

بن کے پھیل گئی۔ اس سمیگوں غبار کی ہلکی ہلکی روشنی میں عبدل آہستہ سے اٹھا اور اس نے جھونپڑے کے سامنے لیٹی ہوئی بانو کے دھڑکتے ہوئے سینے پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے

بانو نے کچھ نہیں کہا۔

اس نے اس وقت بھی کچھ نہیں کہا جب عبدل نے اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں اٹھا کر اسے اپنے کانپتے ہوئے سینے کے ساتھ لگا لیا۔

بانو اس وقت بھی چپ رہی جب وہ اس کے قریب ہی برادے کے ڈھیر پر گر گیا وہ اس کے گرم سانس کا پیغام سن رہی تھی اور ہوئے ہوئے اپنی مٹھیوں میں لکڑی کا برادہ جمع کر کے اسے زمین پر گرا رہی تھی۔

عبدل نے ہوئے ہوئے اپنی گرم انگلیوں کی جنبش سے بانو کا رخ اپنی طرف پھیر لیا اور اس کی ٹھوڑی کو اتنا اونچا کر لیا کہ بانو کی آنکھوں کی پتلیوں میں چاند چمکنے لگا۔ اور اس کی گردن کا صبیح خم آرے کی دھار کی طرح چمکنے لگا۔ عبدل نے اس خم کے دونوں طرف ہاتھ رکھ دیئے اور بولا

"تمہارے باپ نے ٹھیک کہا تھا کہ میں یہاں شہد چکھنے کے لئے آیا ہوں۔"

اور اتنا کہہ کے عبدل نے اپنے ہونٹ بانو کے ہونٹوں پر رکھ دیئے اور اس کی گرفت بانو کی گردن پر مضبوط ہو گئی۔ بانو نے اضطراب کے عالم میں اپنے ناخن عبدل کے شانوں میں گاڑ دیئے اور عبدل کی پیاسی آگ بانو کی روح کے گداز میں یوں ڈوبتی گئی جیسے اب ان دونوں کے جسم برادے کے ڈھیر میں دھنستے جا رہے ہیں۔

یکایک ایک زور کے جھٹکے سے بانو نے اپنے آپ کو عبدل کی گرفت سے آزاد کرا لیا اس نے بالوں سے برادے کو جھاڑ کے الگ کیا اور اپنے ہونٹوں سے ایک

باریک سی پھونک مار کے کہنے لگی۔

" اونہہ ۔ بُرادہ ہی بُرادہ ہے "

عبدل ہنسا۔

" شش ۔" بانو نے انگلی اپنے پتلے ہونٹوں پر رکھتے ہوئے کہا۔ " اگر اس وقت ابا جاگ جائیں تو ــــ "

" تو مجھے مار ہی ڈالیں "

" ہاں اس میں شبہ ہی کیا ــــ " بانو نے گردن جھکا کے کہا

" مگر یہ لوگ ایسی کڑی مشقت کر کے سوئے ہیں کہ فجر سے پہلے ان کی آنکھ نہیں کھل سکتی۔

بانو نے اطمینان سے مسکرا کے کہا۔

" یہ تو ٹھیک ہے ۔ مگر ــــ تمہارا نام کیا ہے "

عبدل نے مسکرا کر کہا۔

" میرا نام عبدل ہے اور تمہارا نام بانو ہے "

بانو نے پوچھا

" تم کیا کام کرتے ہو ۔"

" شہر پٹنہ میں اسکول میں پڑھاتا ہوں۔

" پڑھاتے ہو ــــ " بانو اتنا کہہ کے تھوڑی دیر چپ رہی پھر آہستہ سے بولی

. جہاں میری منگنی ہوئی ہے وہ بھی شہر میں ہے " پولیس میں نوکر ہے ۔ سنا ہے بڑا ہی ظالم آدمی ہے ۔ "

"کیا نام ہے اس کا — ؟

"کریم خان —— " بانو نے آہستہ سے کہا۔ میرے ابا کو منگنی پر اس نے ساڑھے سات سو روپیہ دیا تھا اب شادی پر پانسو روپیہ اور دے گا جب ہماری شادی ہو گی — "

"کب ہو گی۔ ؟

" اگلے سال بیساکھ کو وہ کہتا تھا —— مگر میری مرضی نہیں ہے "

"کیوں — ؟

"اس کی شکل اچھی نہیں ہے پھر بڑا ظالم معلوم ہوتا ہے "

"میری شکل کیسی ہے —" عبدل بولا

بانو ہنسی۔ اونہوں ....

اتنا کہہ کے اس نے لکڑی کا برادہ مٹھی میں بھر کے عبدل کے منہ پر پھینک دیا مگر عبدل اس سے پہلے ہی آنکھیں بند کر چکا تھا اپنے چہرے سے برادہ صاف کرتے ہوئے عبدل نے کہا۔

" شادی تو میری اور تمہاری ہو گی لیکن میرے پاس منگنی کے ساڑھے سات سو نہیں ہیں اور شادی کے پانسو بھی نہیں ہیں۔

" کیا تمہارے ماں باپ بہت غریب ہیں "

" ہاں - ہاں "

" تو پھر تم کیسے اتنا پڑھ گئے۔

" اپنی لیاقت سے پڑھا ہوں اپنی محنت سے "

"آٹھ جماعتیں ــــ" بانو نے حیرت سے پوچھا

عبدل نے سر ہلا دیا۔ اور اب اسکول میں پڑھاتے پڑھاتے اگلی دو جماعتیں بھی پڑھ چکا ہوں ــــ اب گھر جا رہا ہوں وہاں ابّا اماں سے مل کر چند روز کے بعد واپس شہر چلا جاؤں گا۔ اور پھر وہاں سے راولپنڈی دس جماعتوں کا امتحان دینے جاؤں گا۔

"پھر تم کیا بن جاؤ گے"

"پھر میں ماسٹر بن جاؤں گا یا کون جانے تحصیلدار بن جاؤں گا۔"

"تحصیلدار ــــ؟"

بانو کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ پھر وہ عبدل سے ذرا الگ ہو کے بیٹھ گئی۔

عبدل نے ہاتھ بڑھا کے اس کی کمر کو پھر اپنی گرفت میں لے لیا ــــ مگر بانو افسردہ بیٹھی رہی ــــ بالکل بجھی ہوئی .....

عبدل بولا "میرے پاس ساڑھے سات سو بھی نہیں ــــ پانسو بھی نہیں ہیں پھر بھی تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

بانو بولی۔

"یہ کیسے ہو گا ــــ ابّا نہیں مانیں گے۔ انہوں نے ساڑھے سات سو روپے میں دھان کے کھیت خریدے ہیں۔ کھیت کسان کا بچہ کہاں چھوڑتا ہے۔" پھر وہ رک کے بولی۔ "آؤ کہیں بھاگ چلیں ــــ"

"مگر کہاں ــــ" عبدل بولا مجھے تو ابھی راولپنڈی جانا ہے۔ دسویں کا امتحان دینے۔"

"ارے بھاڑ میں ڈالو دسویں کو ـــ بہت پڑھ لیا تم نے۔" بانو بولی

"نہیں۔ نہیں ـــ"

عبدل نے بڑی سختی سے کہا

بانو چپ ہو گئی

پھر عبدل بولا۔ جب میں تحصیلدار ہو جاؤں گا ـــ"

"کب ہو گے؟"

"دو یا تین سال!"

بانو جھنجھلا کے بولی "ہونہہ ـــ اگلے بیساکھ تو میری شادی ہو جائے گی"

عبدل بولا

"کیا تم دو سال بھی نہیں ٹال سکتیں جو دل لگاتے ہیں وہ تو آخری دم تک نبھاتے ہیں۔

بانو عبدل کے ساتھ چمٹ گئی ـــ کانپتے ہوئے بولی ـــ آؤ کہیں بھاگ چلیں ـــ مجھے اس پولیس والے سے بڑا ڈر لگتا ہے دو بیویاں اس کی پہلے بھی مر چکی ہیں ـــ"

"تم نہیں مرو گی ـــ"

عبدل نے بانو کو گلے سے لگا کر کہا ـــ میں جب اپنے گھر سے واپس آؤں گا تو یہاں سے تم کوسے کے شہر چلا جاؤں گا۔"

بانو کا اداس چہرہ کھل اٹھا ـــ وہ اس کے کھردرے رخساروں پر اپنے نرم ہاتھ پھیرنے لگی اور گنگنانے لگی۔

ایک لکڑی چیرنے والا تھا ـــــ ایک اس کے دل کی رانی تھی۔
محبت کی رات تھی۔

پھر وہ اطمینان کا سانس لے کر اس کی آغوش میں سو گئی۔ اور بڑی دیر تک عبدل اس کے باہنوں کو اپنے سینے سے لپٹائے سوچتا رہا۔

آخر وہ آہستہ سے اٹھا۔

بانو کو اٹھائے ہوئے اس نے بڑی احتیاط سے خیمے کے آگے سے گزر کر بانو کو جھونپڑی کے اندر لٹا دیا اور خود آرے کے نیچے آ کے بیٹھ گیا۔

اس کے قریب الاؤ چمک رہا تھا ـــــ قریب ہی کرم داد اور نورا سوئے پڑے تھے ـــــ کہیں دور دور جنگل کی تاریکی میں انگارے سے چمکتی ہوئی آنکھیں نظر آجاتیں ـــــ کہیں دور گیدڑ چیخ اٹھتا ـــــ اور دو چار بھیڑیئے مل کر غل مچاتے پھر چاروں طرف سناٹا چھا جاتا۔ ہوا کے جھونکے جنگل کی مہک سے بوجھل ہو جاتے۔

عبدل دیر تک جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ اس نے چاند کو دونوں صلیبوں اور آرے کے درمیان سے گزرتے ہوئے جنوبی سمت میں غائب ہوتے دیکھا اس نے سات ستاروں کو ایک افق سے دوسرے افق کی جانب بڑھتے دیکھا جب کہکشاں بھی ماند پڑنے لگی تو دہ کا غان کی ندی کا شور اور ہوا کے بڑھتے ہوئے جھونکوں کی سرگوشیاں سنتے سنتے وہیں سو گیا۔

بیوقوفی

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں اور میرا دوست امام دین ایک جنگل میں سے گزر رہے تھے دوپہر کا وقت تھا۔ جنگل خاموش تھا —— چاروں طرف ایک پرستانی خواب کا سا منظر تھا فرشِ راہ پر بیر کے پیڑ کے زرد پیلے پتوں کے گچھے ایک نرم اور گداز غالیچے کی طرح بچھے ہوئے تھے۔ پرندے ٹہنیوں پر اونگھ رہے تھے۔ چند بھیڑیں چر رہی تھیں باقی ایک بڑے درخت کے تنے کے نیچے آرام کر رہی تھیں اس بڑے سناٹے میں چشمے کا پانی بھی سویا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

اس چشمے کے قریب ہی ایک چرواہی اپنا ہاتھ سر کے نیچے رکھے ہوئے سو رہی تھی۔

ہمارے بے قدم آواز ہمیں اس سوتی ہوئی حسینہ کے پاس لے گئے۔ یہ جنگل ایک خاموش قلعہ تھا ایک پرستانی قلعہ، اور یہ خوبصورت شہزادی جنگل کی شہزادی تھی۔ جو غالباً سو سال سے یہیں سو رہی تھی۔

اس کی مدھم پرسکون سانس اس کی چھاتیوں میں ایک مسلسل آہنگ ایک پرکیف لرزش پیدا کرتی ہوئی چل رہی تھی۔ رَواں دَواں رَواں دَواں جیسے ندی بہتے بہتے سو گئی ہو اور اب اسی نیند میں کھوئی ہوئی بہہ رہی ہو۔

خاموشی، سناٹا اور جنگل میں اکیلی لڑکی ——

ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ شائد ایک ہی خیال، ایک ہی لمحے، ایک ہی ساتھ ہمارے دلوں میں پیدا ہوا —— اور ہم دونوں آگے بڑھے۔

قریب سے ایک بھیڑ زور سے چلائی۔ "باآآآآ"۔

لڑکی نے آنکھیں کھول دیں۔ دو اجنبیوں کو اپنے قریب کھڑا دیکھ کر وہ جلدی سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور اپنی پریشان لٹیں ٹھیک کرنے لگی۔

پھر مسکرا کر بولی۔

"چشمے سے پانی پینا چاہتے ہو۔"

"جی ارادہ تو ......"

امام دین نے کہا

لڑکی جلدی سے بولی

"اچھا تو پی لو —— میری تو یونہی ذرا آنکھ لگ گئی تھی چشمے کے کنارے

بہت ٹھنڈک ہوتی ہے نا۔"

گو پیاس نہ تھی پھر بھی پانی پینا پڑا۔

"جب ہم پانی پی چکے تو لڑکی نے پوچھا،

"تم کہاں سے آئے ہو۔"؟

"ہم پردیسی ہیں ——"

امام دین نے معنی خیز نگاہوں سے لڑکی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اور دیس والوں کو پردیسیوں کا خیال ضرور رکھنا چاہیئے"

لڑکی نے بھولپن سے کہا۔

"یہاں سب پردیسی ہیں رہی"

"اُفوہ ——" امام دین نے مجھ سے کہا۔" یہ تو معرفت کی باتیں کرنے لگی۔ چلو میاں یہاں سے —— یہاں دال نہیں گلے گی۔

لڑکی نے یہ فقرہ کسی کتاب میں نہیں پڑھا تھا اس نے یوں ہی بے سوچے سمجھے انتہائی معصومیت اور بیوقوفی کے عالم میں کہہ دیا تھا —— وہ ہوشیار لڑکی ہوتی، پڑھی لکھی لڑکی ہوتی، سمجھدار لڑکی ہوتی تو یوں جنگل میں اکیلے بھیڑ بکریاں نہ چراتی ——!

لیکن وہ تو ایک بیوقوف، ناداں، الھڑ دیہاتی لڑکی تھی اور اس کے پاس اپنی حفاظت کے لئے اپنی بیوقوفی کے سوا اور کچھ نہ تھا اور آخر میں اسی بیوقوفی نے اس کی حفاظت کی —— وہی بیوقوفی اس کی حفاظت کرتی تھی آج بھی جب جنگل میں دو اجنبی آئے تھے اسی بیوقوفی نے اس کی حفاظت کی تھی اور بیوقوفی کی وجہ

سے کبھی اس کے ذہن میں یہ خیال بھی پیدا نہ ہوا تھا۔ کہ کبھی کوئی اجنبی جنگل میں اسکی طرف بُری نیت سے بھی دیکھ سکتا ہے۔

بیوقوف تھی نا بے چاری ــــ، اگر وہ عقلمند ہوتی تو ــــ خیر آپ اخبارمیں اس کا ذکر پڑھ لیتے۔

بیوقوفی کی ایک ادنےٰ مثال ہے لیکن اس سے بھی بیوقوفی کے جوہر اور خواص ہم پر عیاں ہو جاتے ہیں لوگ اس صفت کو طرح طرح کے ناموں سے پکارتے ہیں۔ معصومیت، جہالت، احمق۔ لیکن میں تو اسے بیوقوفی کہوں گا۔

بیوقوفی کو لوگ بہت بُرا کہتے ہیں ــــ بُرا سمجھتے ہیں۔ اس سے نفرت کرتے ہیں، اس پر ہنستے ہیں۔

بخلاف اس کے آج کل عقل کی پرستش کی جاتی ہے، عقل بڑی چیز ہے عقل کا دنیا پر راج ہے اس دنیا پر بھی اور اس دنیا پر بھی، فلاں شخص بیوقوف ہے وہ احمق ہے، وہ جاہل ہے اسے دنیا میں کوئی مرتبہ نہیں ملنا چاہیئے۔ فلاں آدمی بڑا عقلمند ہے، زیرک ہے، دانشور ہے اسے چہار دانگ عالم کی بادشاہت سونپ دو۔ کچھ اس قسم کی تفریق عقلمندی اور بیوقوفی کے درمیان قائم کردی گئی ہے کہ اب ہر انسان عقلمندی کا سہارا ہی پسند کرتا ہے۔

سیاست دان عقلمند ہوتا ہے، شاعر بیوقوف ہوتا ہے۔ سماج کی لکیر پر چلنے والا عقلمند ہوتا ہے، عاشق بیوقوف ہوتا ہے۔ اپنے دماغ کے بل بوتے پر ہل چلانے والا سرمایہ دار عقلمند ہوتا ہے اپنے ہاتھ پاؤں سے کام کرنے والا مزدور بیوقوف ہوتا ہے۔

ناچ گھر میں تھرکتی ہوئی ریشمی لباس میں ملبوس لڑکی عقلمند ہوتی ہے۔ جنگل میں بھیڑ بکریاں چرانے والی چرواہی بیوقوف ہوتی ہے۔

عقلمند اور بیوقوف!

عقلمند ہمیشہ بیوقوف پر ہنستا ہے

سیاست دان شاعر پر، سماج پرست عاشق پر، سرمایہ دار مزدور پر اور تعلیم یافتہ لڑکی چرواہی پر۔

عقلمند اور بیوقوف!

لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ کیوں بیوقوفی کو برا سمجھا جاتا ہے۔ دنیا کی خوبصورت ہنسی کا منبع بیوقوفی ہے۔ اگر دنیا میں بے وقوفی نہ رہے تو خوبصورت لوگ کس پر ہنسیں گے۔ ظاہر ہے کہ وہ اتنے بیوقوف نہیں جو اپنے آپ پر ہنسیں۔ کیونکہ اپنے آپ پر ہنسنے کے لئے بھی بیوقوفی کا عنصر چاہیئے۔ جو عقلمند لوگوں میں ناپید ہے۔ چارلی چپلن کی عظمت کا راز اس کی مضحک احمقانہ بیوقوف حرکات میں ہے۔ وہ خود نہیں ہنستا لیکن اپنی بیوقوفی سے ساری دنیا کو ہنسنے کی دعوت دیتا ہے۔ اور اگر دنیا میں قہقہے نہ رہیں خوبصورت دیگر اگر دنیا میں بیوقوف آدمی نہ رہیں تو یہ دنیا ایک نغمہ شادی سے ایک نوحہ غم میں تبدیل ہو جائے۔

دنیا کی خوشی کے لئے، مسرت کے لئے، ہنسی کے لئے بیوقوفی کا وجود ناگزیر ہے۔

ہنسی اور مسرت کے علاوہ خوبصورتی کا منبع بھی بیوقوفی ہے عورت جتنی بھی

خوبصورت ہو اتنی ہی بیوقوف ہوتی ہے حسن اور عقل کا ہمیشہ بیر رہا ہے اور خوبصورت چیز کبھی عقلمند نہیں ہوتی۔ حسین عورت، چھٹکی ہوئی چاندنی، گلاب کی مسکراتی ہوئی پتی ـــــ کبھی کسی نے ان کو عقلمند پایا ہے۔ پھر نہ جانے لوگ کیوں عقلمندی پر جان چھڑکتے ہیں۔

حسن، ہنسی، مسرت، سچائی دنیا کی کسی اچھی چیز میں عقل نہیں ہوتی پھر بھی یہ لوگ عقل کے پیچھے دیوانے ہیں۔ احمق کہیں کے ـــــ میرا مطلب ہے عقلمند کہیں کے۔

وہ سوال آپ نے بھی سنا ہوگا ـــــ "عقل بڑی کہ بھینس ـــــ" میں تو ہمیشہ بھینس کو ترجیح دوں گا۔ ہر حالت میں بھینس عقل سے بڑی ہے۔ بھینس دودھ دیتی ہے، مکھن اور چھاچھ اور پنیر۔ اس کی ہڈیوں سے کھاد تیار ہوتی ہے اس کے سینگوں سے بٹن اور چاقوؤں کے دستے تیار کئے جاتے ہیں اس کی کھال سے جوتے۔ بھینس ہر حالت میں زندگی اور موت میں عقل سے بڑی ہے اس کا رواں رواں انسان کو فیض پہنچاتا ہے اور عقل ـــــ ؟

عقل نے آج تک انسان کے لئے کیا کیا؟

بول بول اے رقص گاہ میں ناچتی ہوئی لڑکی! ذرا اس جنگل میں جاکر اپنے حسن کا اس چرواہی کی خوبصورتی سے مقابلہ کرکے تو دیکھ۔ اپنے الجھے ہوئے پریشان ذہن کا اس چرواہی کی ذہنی شگفتگی، بے ساختہ پن اور بیوقوفی سے مقابلہ کر، پھر مجھے بتا چل جائے گا کہ عقل بڑی یا بھینس؟

سرمایہ دار ہمیشہ مزدور پر ہنستا ہے بیوقوف جاہل ـــــ مجھے دیکھو، میں

اپنی عقل سے ان لاکھوں مزدوروں کا حاکم ہوں۔ یہ کارخانہ چلاتا ہوں۔ میری آمدنی لاکھوں روپوں میں شمار کی جاتی ہے اور اس مزدور کو چند ٹکے ملتے ہیں، کیونکہ یہ بیوقوف ہے۔

اگر میری طرح عقلمند ہوتا تو اس کی یہ درگت نہ ہوتی۔ عقل ہر حالت میں افضل ہے۔ سماج پرست ہمیشہ عاشق پر ہنستا ہے۔ میری بیوی ہے۔ بچے ہیں گھر ہے، رشتہ دار ہیں، دنیا میں عزت ہے۔ مرنے کے بعد جنت ٹھکانا ہے اور وہ تو باغی، منحرف جنگلوں اور صحراؤں کی خاک چھانتا ہے مجنوں! تیشہ لے کر چٹانیں کاٹتا ہے۔ کچے گھڑے پر چناب عبور کرنا چاہتا ہے۔ بیوقوف جاہل عاشق نہ تیری نیند اپنی ہے نہ راتیں ـــــ نہ تجھے اس دنیا میں آرام حاصل ہے نہ عقبیٰ کی فکر ـــــ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ بیوقوف!

سیاست دان ہمیشہ شاعر پر ہنستا ہے۔ میں کام کرتا ہوں۔ یہ شعر کہتا ہے میں دنیا کا نظام چلاتا ہوں یہ خواب دیکھتا ہے۔ میں بلند عمارتیں کھڑی کرتا ہوں یہ درخت کے سائے تلے سوتا ہے۔ میں قوم کی تقدیر بدلتا ہوں۔ یہ کتاب کے ورق الٹتا ہے۔

جاہل، بیوقوف، بے مصرف!

عقلمندوں کے استدلال کا جواب بیوقوف کے پاس کیا ہوگا۔ وہ ہر حالت میں بیوقوف ہے وہ تو صرف یہ جانتا ہے کہ انسان نے سینکڑوں سال سے اپنی مسرت عقلمند آدمیوں کو سونپ رکھی ہے لیکن ان عقلمند آدمیوں نے آج تک انسانی خوشی مسرت اور حسن میں ایک لمحہ کا اضافہ بھی نہیں کیا۔ جوں جوں عقلمندی

بڑھتی ہے سماج کا دائرہ تنگ ہونے لگتا ہے اور ناچ گھر کا دائرہ وسیع ہونے لگتا ہے، طوائفیت پھیلتی ہے، عشق مرتا ہے۔ قوموں میں جنگیں ہوتی ہیں کارخانوں میں ہڑتالیں ہوتی ہیں کیونکہ ہر عقلمند سرمایہ دار چاہتا ہے کہ اس کا کارخانہ ہر سال سے زیادہ منافع حاصل کرے۔ اسی انفرادی کوشش میں مزدوروں کی حالت زبوں ہوتی جاتی ہے حتےٰ کہ یہ عقلمندی ان جاہل مزدوروں کو انقلاب کا درس دینے لگتی ہے اس طرح ہر عقلمند سیاست دان یہ چاہتا ہے کہ اس کی قوم ترقی کرے اور دنیا کی سب قوموں سے بازی لے جائے۔

لیکن زمین ایک ہے اور اس کرۂ ارض کی جغرافیائی حدود ہیں اس لئے یہ عقلمندی قوموں میں پیکار اور جنگ کا نقشہ دکھاتی ہے۔ اور ہر پچیسویں سال نئی جوان نسل انسانی نسل خاک و خون کے بستر پر لوٹتی نظر آتی ہے کیونکہ دنیا میں عقلمند سیاست دان کا راج ہے۔ شاعروں کا نہیں۔ سماج پرستوں کا غلبہ ہے عاشقوں کا نہیں۔ ناچ گھر میں ناچتی ہوئی لڑکیوں کا اثر ہے۔ چرواہیوں کا نہیں، سرمایہ داروں کا تحکم ہے مزدوروں کا نہیں۔

سینکڑوں برس انسانیت نے ان عقلمند سیاست دانوں جاگیرداروں سرمایہ پرستوں سماج کے ٹھیکیداروں اور طوائفیت میں پلی ہوئی حسیناؤں کی دانش کا تجربہ کیا ہے اگر اب چند دنوں کے لئے احمق شاعروں، عاشقوں، مزدوروں اور چرواہیوں کی بے وقوفی کا بھی تجربہ کر کے دیکھ لیا جائے تو کیا ہرج ہے سینکڑوں سال سے ہم لوگ عقلمندوں کی رہگذر پر چلتے آرہے ہیں اگر وہ گھڑی بیوقوفی کی جھاڑی میں دم لے لیں تو کیا ہرج ہے۔

"احمق کہیں کا۔ بیوقوف!

یہ سچ ہے کہ میری تجویز احمقانہ ہے لیکن کبھی کبھی تو سچ مچ جی چاہتا ہے۔ کہ اس عقلمندی کا گلا گھونٹ دیا جائے لیکن پھر سہم کر رہ جاتا ہوں کیونکہ اس دنیا میں بڑے بڑے عقلمندوں کا راج ہے ـــــ اور ـــــ

کاش دنیا کے سب لوگ بیوقوف ہوتے!

گومتی کنارے

جس روز لکھنؤ پہنچا اسی دن احباب نے لامارٹی نیا میں ایک پکنک کا انتظام کیا تھا چنانچہ ہم لوگ اکّوں میں سوار ہو کر رات کے نو بجے لامارٹی نیا پہنچے لکھنؤ کا اِکّہ لکھنؤ کی ایک خاص چیز ہے نہ صرف دیکھنے کی بلکہ بیٹھنے کی۔ دُور سے اِکّے کو دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے گھوڑے کو پھندا لگایا ہے اور قریب جایئے تو معلوم ہوتا ہے کہ گھوڑا صید نہیں خود صیاد ہے اور اکّے میں بیٹھنے والے کو پھانسی کی سزا دے رہا ہے۔ یہ اِکّے کے کرشمے ہیں کہ جب آپ اس میں بیٹھیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ آپ اِکّے پر سوار نہیں ہیں اکّہ آپ پر سوار ہے اکّہ جھولتا ہے جھولتا ہے زندگی اور موت کے درمیان نئے زاویئے بناتا ہوا آپ کی ہڈی ہڈی جھنجھوڑ ڈالتا ہے اور شکستہ سڑک کے پتھروں سے ٹکراتا ہوا خوشی سے گنگناتا ہوا مست

شرابی کی چال سے لامارٹی نیا کی طرف بھاگا جا رہا ہے

دور بہت دور کسی ہندوستانی فلم کی طرح جس کے انجام کا کچھ پتہ نہ ہو لیکن سوچیے کہ یہ اِکے کی سواری کیوں؟

اس میں بیٹھنے سے تو بہتر یہی ہے کہ آدمی کسی پنجرہ پول میں جا بیٹھے اور اپنے آپ کو کسی بوڑھے سوتری کے حوالے کر دے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو لیکن صاحب اِکے کے ایک ہزار فائدے ہیں۔ پہلے تو یہی فائدہ ہے کہ ہمارے سارے جسم کی مالش کرتا ہے اور لکھنؤ والے ورزش کرنے کے عادی نہیں ہیں لیکن ورزش بقائے حیات کے لئے ایک بہت اچھا فعل ہے اس لئے اگر لکھنؤ میں وہی فرض بجا لاتا ہے جو لاہور میں دنگل یا اکھاڑہ اور بمبئی میں جمنیزم اور دیہات میں سرسوں کا تیل اور امیر گھروں میں روغن بادام اور پھر ان تمام چیزوں کا بدل ہے اور وہ ہے اکّہ۔

اور اس پر لطف یہ کہ سستا بھی ہے اور امیر غریب جوان بوڑھا بچہ ہر ایک اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

لیکن اکّہ صرف جسم کو ہی نہیں بلکہ رُوح کو بھی فیضان پہنچاتا ہے۔ جب تک آپ اکّے میں بیٹھے رہیں موت آپ کی آنکھوں کے سامنے کھڑی رہتی ہے زندگی اور موت میں جو ایک باریک سا پردہ حائل ہے اکثر اٹھتا ہوا نظر آتا ہے اور اکّے میں بیٹھا ہوا انسان اکثر حیات و ممات کی حدیں پار کر کے فنا اور شعور اور ادراک سے پرے اس جہان رنگ و بو کا تماشہ کرتا ہے جسے لوگ جنت یا جہنم یا اعراف کے نام سے پکارتے ہیں اور گو یہ تینوں نام مختلف ہیں ان کا مظہر صرف ایک ہے ایک اِکّہ۔

میں بھی اکہ میں بیٹھا ہوا کشمکشِ حیات کو اسی فلسفیانہ نقطۂ نظر سے دیکھ رہا تھا۔ کہ میرے ساتھی کی کوہنی ایک وحشیانہ انداز میں میری پسلیوں میں جا لگی میرا ساتھی میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ بلکہ یوں کہیئے کہ مسکرانے لگی۔ کیونکہ وہ ایک عورت تھی۔

ایک بدصورت، فربہ اندام، سفید رنگ کی عورت جسے اپنے حسن پر بے حد ناز تھا (محترمی صلاح الدین احمد صاحب کو گلہ ہے کہ میں ہمیشہ بدصورت عورتوں کا ذکر کیوں کرتا ہوں ان کا خیال ہے کہ مجھے بدصورت عورتوں سے عشق ہے بلکہ بدصورت عورتوں کو مجھ سے عشق ہے)

حادثات ہیں زمانے کے۔ یا یوں کہیئے کہ اپنی اپنی قسمت ہے ورنہ اگلے اکے میں جاوید کی بغل میں ایک نہایت خوشرو نازک اندام لڑکی بیٹھی تھی اور ہمارے پیچھے پیچھے جو اکہ آرہا تھا۔ اس میں دو نوخیز دوشیزاؤں کے درمیان عشرت صاحب ہنسی کا گول گپا بنے ہوئے چلے آرہے تھے۔ خوش شاداں و فرحاں، اب مجھے معلوم ہوا کہ پک نک پر جانے کے لئے اکے کیوں مہیا کئے جاتے ہیں۔ اکے پر بدن چرانے کا امکان باقی نہیں رہتا۔ ایک دوسرے پر گرے پڑتے ہیں ہاتھ خود بخود کمر میں ڈال دیئے جاتے ہیں۔ بال پریشان ہو جاتے ہیں۔ خوشبوئیں اڑ اڑ کر نتھنوں میں پہنچنے لگتی ہیں۔ مزے سے شانہ بشانہ بیٹھے ہیں اور اکثر ایسا دھچکا لگتا ہے یا یوں ہی محسوس ہوتا ہے کہ ایک ایسا دھچکا لگا۔ کہ گال سے گال چھو جاتے ہیں اور بوس و کنار کا سارا لطف حاصل ہو جاتا ہے اور وہ بظاہر گھبرا کر کہتی ہیں۔

"اوئی ــــ یہ اکہ کس قدر برا ہے (یعنی اے کاش یہ اکہ اس سے بھی برا ہوتا۔

لیکن جیسا کہ میں نے ابھی کہا۔ اپنی اپنی قسمت ہے۔ اور صلاح الدین احمد صاحب کو مجھ سے شاکی ہونے کی بجائے میری قسمت سے شاکی ہونا چاہیئے میں اکے میں بیٹھا تھا۔ یا لیٹا تھا یا اکڑوں تھا یا چلتا تھا۔ اتنا ضرور پتہ ہے کہ میں اکے میں تھا اور وہ بدصورت قریب اندام، سفید رنگ کی عورت دیوار چین بنی اس میں بیٹھی تھی اس نے اپنے بالوں میں ایک نہایت تیز قسم کی جاہلانہ خوشبو لگا رکھی تھی اور گاہے گاہے وہ مجھے التفات کی نگاہوں سے اس طرح دیکھتی تھی جس طرح بلی چوہے کی طرف دیکھتی ہے۔ میں کانپ کر ذرا پرے سرک گیا اور ان کی موٹی کہنی میری پسلیوں میں جا لگی۔

میں نے بات ٹالنے کے لئے کہا:

"آہا کس قدر سہانا منظر ہے یہ درختوں کی پرچھائیاں یہ چاندنی رات کا دھندلا دھندلا غبار، یہ سنکیرے کے پھول شعلوں کی طرح دہکتے ہوئے۔

دیوار چین نے ایک آہ بھری ـــــ ایک تیز چھنکار اور دوسرے لمحے میں گوشت و پوست کا یہ طوفان عظیم میری منحنی آغوش کی طرف جھکتا ہوا دکھائی دیا میں ذرا اور پرے سرکا لیکن ذرا پرے اکہ نہ تھا ـــــ خلا تھی۔ کائنات تھی زمین کی کشش ثقل تھی۔ سارا نظام فلکی گردش کر رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں سڑک پر گر پڑا اور وہ چنگھاڑیں۔

"ابے لینا ـــــ لینا ..... اوہ ٹھہراؤ اکہ .....

جاوید مسکرا رہا تھا کمینہ!

لکھنؤ میں گومتی بھی ہے جہاں سری رامچندر جی نے خودکشی کی تھی لیکن اس کے ٹھہرے ہوئے پانی اور میلی متعفن فضا کو دیکھ کر کس کا جی خودکشی کرنے کو نہیں چاہتا۔ سارے شہر کے گندے نالے گومتی میں آکر مل جاتے ہیں اور گمان ہوتا ہے کہ گومتی کا اپنا کوئی وجود نہیں بلکہ وہ اپنی غلیظ اور گندے نالوں سے مل کر بنی ہے۔ شاید اسی وجہ سے گومتی کو پیار سے "گھر لوندی" کہا جاتا ہے۔

اس ندی میں شام کے وقت لوگ تفریح کے لئے کشتی چلاتے ہیں اس کے کنارے کنارے سیر کرتے ہیں اور شعر گنگناتے پھرتے ہیں۔

گومتی کے اس پار لکھنؤ کا شہر ہے اور اس پر لکھنؤ یونیورسٹی۔ نام لکھنؤ یونیورسٹی ہے لیکن پروفیسر سب بنگالی ہیں اور طلباء سب پنجابی یا بہاری یا سندھی قیاس غالب ہے کہ لکھنؤ کے طلباء لکھنؤ میں پڑھنا پسند نہیں کرتے۔ یہی حال دیگر تعلیمی اداروں کا ہے۔ میرس کالج آف میوزک میں مرہٹے ہیں۔ گجراتی ہیں، سیلونی ہیں، اندھرا دیش باسی ہیں بنگالی ہیں۔ لکھنؤ والے ناپید ہیں۔ لڑکیوں کا کالج ہے لیکن تقریباً سب لڑکیاں باہر سے آتی ہیں۔ اگر کوئی لڑکی اپنے آپ کو لکھنؤ کا بتاتی ہے تو سمجھ لیجئے کہ شاعری کر رہی ہے۔ ایک نہ ایک دن کسی کے ساتھ بھاگ جائے گی ——!

ایک اور عجیب بات جو میں نے لکھنؤ میں دیکھی وہ یہ کہ لکھنؤ میں شاعر نہیں کوئی شاعر نہیں۔ میں ایک دفعہ پورے تین دن اکے میں بیٹھ کر ہاتھ میں گھڑیال لے کر لکھنؤ کے بازاروں اور گلی کوچوں کا چکر لگاتا رہا —— کوئی ہے شاعر ——؟ کوئی ہے شاعر ——؟ لیکن مجھے کوئی شاعر نہ ملا —— نہ شاعر نہ نواب، نہ بٹیر باز، نہ

پتنگ باز، یہ لوگ جو لکھنؤ کو بیکاروں کا مسکن بتاتے ہیں۔ لکھنؤ کے سب سے بڑے دشمن ہیں اور اس اختراع کی بنیاد پہلے پہل خود لکھنؤ والوں نے اپنے ہاتھوں سے رکھی۔ یعنی خدا بخشے عشرت لکھنوی اور رتن ناتھ سرشار نے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے بیکاروں کی تعداد لکھنؤ میں ہندوستان کے اور شہروں سے زیادہ نہیں۔ میں نے تو یہاں مزدور دیکھے، دوکاندار دیکھے، فوجی دیکھے کلرک دیکھے، خوانچہ فروش دیکھے، ہوٹل والے دیکھے۔ اکّے والے دیکھے۔ لیکن بٹیر باز اور پتنگ باز کہیں نہ ملے۔ چانڈو خانہ کہیں نہ ملا۔ افیم گھولنے کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ ناچار کافی ہاؤس میں جا بیٹھا اور ان سفید فام زلف بریدہ کشمیری نژاد لڑکیوں کی طرف دیکھتا رہا جو کبھی کشمیر کے جنگل میں وحشی ہرنیوں کی طرح قلانچیں بھرتی تھیں اور آج جارجٹ کی ساڑھی میں ملبوس ایک میز کے کنارے کافی کا پیالہ ہاتھ میں لئے پالتو مینا بنی بیٹھی تھیں۔

ہائے اس انسان کی خود فریبی۔ جب یہ چند تنکے یا تیلیاں چن کر اپنے ارد گرد ایک گھونسلا یا پنجرہ کھڑا کر لیتا ہے تو پھر اس قید خانوں کی سلاخوں سے باہر جھانکتا ہے اور پنجرے سے باہر رہنے والوں کو وحشی، بربری، غیر مہذب اور نہ جانے کیا کیا کچھ بتاتا ہے ابھی تک یہ پنجرے، یہ پالتو میناؤں اس انسانی تہذیب کے اثاث کلی ہیں اور جب میں کہتا ہوں کہ اس کافی ہاؤس کی گھٹی فضا سے جنگل کی مہکی ہوئی فضا بہتر ہے۔ جب میں کہتا ہوں کہ کافی پینے سے کسی میٹھے چشمے کا پانی پینا بہتر ہے جب میں کہتا ہوں کہ جارجٹ پہننے سے بھیڑیں چرانا یا انگی بنانا زیادہ خوبصورت ہے، زیادہ صحت بخش ہے تو لوگ ہنس دیتے ہیں — رومانیت پسند..... پتہ نہیں ان

مہذب قفس پسند لوگوں کی خود فریبی کب ختم ہو گی!

کہتے ہیں لکھنؤ باغوں کا شہر ہے اور یوں دیکھا جائے تو لکھنؤ میں باغ بہت ہیں۔ ایک تو قیصر باغ ہے — چند ایک گندے محلوں کا مجموعہ ہے۔ یہاں دو ایک گولر کے روکھے سوکھے درخت بھی ہیں جن کے نیچے ننگ دھڑنگ بچے لٹو گھماتے رہتے ہیں۔ نذر باغ میں باغ تو کیا ایک جھاڑی بھی نہیں البتہ پان کے پتے کثرت سے دیکھنے میں آتے ہیں اور جہاں پان کے پتے ہوں وہاں تاش کے پتے بھی ضرور دکھائی دیں گے۔

پھر "چار باغ" ہے۔ یہاں لکھنؤ کے چار باغ ملتے ہیں لیکن یہ صرف تخیل ہے حقیقت یہ ہے کہ یہاں چار باغ نہیں ہیں بلکہ چار ریلوے لائنیں ملتی ہیں اس لئے یہاں پر ایک ریلوے اسٹیشن بنا دیا گیا ہے جو لکھنؤ ریلوے اسٹیشن کے نام سے مشہور ہے اور اس کے سامنے تانگے والوں کا شیڈ ہے جہاں حقے کی بو اور گھوڑوں کی لید مشامِ جان کو تازہ کرتی ہے۔ پھر سکندر باغ ہے جہاں باغ کم اور قبریں زیادہ ہیں۔ جنہیں دیکھ کر "سکندر کے ہاتھ دونوں خالی کفن سے نکلے" والی نظم یاد آتی ہے لے دے کے ایک نباری باغ رہ گیا تھا لیکن اس میں بھی یار لوگوں نے چڑیا گھر بنا دیا ہے اور ہاتھی لومڑ چیتے اونٹ الم غلم سب لا کے جمع کر دیا ہے..... سمجھ میں نہیں آتا ان لوگوں کی عقل کو کیا ہوا ہے۔

لکھنؤ کی عمارتیں آہا! آہا! لکھنؤ کی عمارتیں ہندوستانی فن تعمیر کے دور انحطاط کے بہترین نمونے ہیں دراصل اس ضمن میں صرف لکھنؤ کو مطعون کرنا سخت غلطی ہوگی پورے ہندوستان کا یہی حال ہے۔ جس تدر گھٹیا اور پست درجے پر ہمارا فن تعمیر پہنچ

چکا ہے۔ ہندوستانی فنونِ لطیفہ کے کسی اور شعبے میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ ہم قبریں اور سمادھیں محلوں کی طرح عالیشان اور پُرشکوہ بناتے ہیں اور محل قبروں کی طرح بدصورت اور یاس انگیز۔ یہی حال ہماری عبادت گاہوں کا ہے مسجد، مندر، گوردوارے اور دھرم شالائیں ہماری بیشتر عبادت گاہیں نہ تو گاتھک گرجاؤں کی طرح آسمان کی طرف اٹھتی ہیں، نہ چینی عبادت گاہوں کی طرح زمین کی طرف جھکتی ہیں ان میں ایک عجیب سی کمینگی، رذالت اور تنگ نظری پائی جاتی ہے تاریک در و دیوار، گندے فرش نما ناک فضا، ان عمارتوں میں نہ جامع مسجد کی وسعت اور وجاہت ہے، نہ ایلورا کے مندروں کی سی خوبصورتی، نہ اجنٹا کے پراسرار ماحول، ہماری قومی ذلت اور انحطاط نے ان عبادت گاہوں میں بھی گھر کر لیا ہے۔

حال ہی میں نئی دلّی میں برلا مندر بنا ہے اس پر لاکھوں روپے صرف ہوئے ہیں باتوں تو مندر یہ ہے لیکن دور سے دیکھئے تو بالکل کسی بینک کی عمارت کا دھوکہ ہوتا ہے۔ یہ بھی ہمارے بدلتے ہوئے تمدنی نظام کا تاثر ہے کہ آج کل کی عبادت گاہیں بنک نظر آتی ہیں اور بینک عبادت گاہیں۔

آپ کسی بینک میں چلے جائیے بالکل کسی پرانی عالیشان عبادت گاہ کا سا منظر پائیں گے۔ خاموشی پُراسرار سناٹا۔ کلرک سر بسجود ہیں رجسٹروں پر جھکے ہیں اور خدا کو یاد کر رہے ہیں۔ بڑی بڑی بلوریں قندیلیں۔ جھاڑ اور فانوس چھتوں سے لٹک رہے ہیں جن کے نیچے لوگ ایک گہری عبودیت سے آشنا ہو کر نہایت خضوع و خشوع سے نوٹ گن رہے ہیں کبھی کبھی منیجر کی آواز کسی متبرک پاکیزہ اشلوک کی طرح فضا میں گونج جاتی ہے اور سارے ماحول کو اور بھی پُراسرار بنا دیتی ہے

یہاں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی، سکھ بھی اور عیسائی بھی اور جس گہرے انہماک اور توجہ اور علم کا اظہار وہ یہاں کرتے ہیں ان کی زندگی کے کسی اور شعبے میں نظر نہیں آتا......

لکھنؤ میں جہاں میں ٹھہرا تھا اس کے قریب ہی کسی راجہ نے اپنا محل بنوایا تھا۔ یہ چار منزلہ عمارت تھی۔ چھوٹی بالکونیاں تنگ چوکور کھڑکیاں۔ دروازے پر مٹی کے ہاتھی اور لنگور اور ہر منزل پر مٹی کے خالی گملے ان چھتوں کے کنارے دھرے ہوئے تھے جن میں بے برگ جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ سب سے نچلی منزل میں دو پتھر کے ستون تھے جن کے ساتھ ساتھ دو سپاہی بنائے گئے تھے یہ پتھر کے سپاہی گویا اسی محل کی حفاظت کر رہے تھے کیونکہ ان سپاہیوں کے ہاتھوں میں پتھر کی تلواریں تھیں ساری عمارت سے ایک عجیب قسم کی نحوست کا اظہار ہوتا تھا۔ نحوست اور رذالت اور بنیا پن ——— جیسے یہ کوئی عمارت نہ تھی بلکہ کوئی ساہوکار تھا۔ جو آلتی پالتی مارے اپنا بہی کھاتہ کھولے بیٹھا تھا۔ اور سود در سود لگا رہا تھا۔ میرا یہ اعتقاد ہے کہ ہر عمارت اس کے بنانے والے اور اس کے مالک کی روحوں کا آئینہ ہوتی ہے اور مجھے تو ہندوستان کی بیشتر عمارتوں کو دیکھ کر ہی ہندوستانی روح کی بلندی اور فضیلت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

اور گو اب لکھنؤ میں شاعری نہیں ہوتی۔ لیکن بانکپن اب بھی ہوتا ہے، لاہور کا بانکپن مشہور ہے۔ بانکپن بلکہ یوں کہیئے کہ ترچھا پن اور اگر زیادہ جمالی تعریف منظور ہو تو یوں کہیئے کہ سبطِ حسن، میرا دوست سبطِ حسن اس لکھنوی بانکپن کی مثال ہے۔ آڑا ترچھا۔ مموے کی چال سے چلتا ہوا اس کے بالوں کی تراش تک

ترچھی ہے۔ لکھنؤ کی ککڑیاں دیکھئے، ایسی باریک باریک سخنی، لطیف کہ معشوق کی انگلیوں کا دھوکہ ہوتا ہے۔

لکھنؤ کے خربوزے ایسے ہلکے پھلکے۔ پیارے پیارے روئی کے گالوں کی طرح لکھنؤ کے آم گٹھلی تک ناپید، لکھنو کی اے آر پی کی گھنٹی کی آواز ایسی شیریں، باریک لوچدار کہ اس پر ارغواں کا دھوکہ ہوتا ہے سبطِ حسن سے لے کر لکھنو کی ککڑی تک لکھنو کی ہر چیز بانکی ہے اور لکھنؤ کے معشوق کے بانکپن کا تو یہ عالم ہے کہ بیان کیا جاتا ہے کہ لکھنو میں معشوق کے کمر نہیں ہوتی۔ گلے میں آواز نہیں ہوتی۔ دماغ میں عقل نہیں ہوتی، ایسا بانکا نرالا البیلا معشوق آپ کو لکھنؤ کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتا ـــــ اور خدا کا شکر ہے کہ اب تو لکھنؤ میں بھی نایاب ہے)

کسی نے مجھ سے کہا ـــــ صاحب اگر آپ کو اصل لکھنؤ دیکھنا منظور ہے۔ تو نخاس چلئے۔ نخاس۔ نخاس لکھنؤ کی جان ہے۔ چنانچہ میں ایک دن لکھنؤ کی جان دیکھنے نکلا۔ نخاس میں میں نے دیکھا کہ وہاں اب تک پرانی چیزیں نیلام ہوتی ہیں، پرانی کتابیں۔ پرانے پلنگ۔ نخاس میں جو چیز ہے۔ پرانی اور تاریخی ہے۔ یہ ساعز اس میں واجد علی شاہ شراب پیا کرتے تھے۔ یہ گھڑیال مہاراجہ چندولال کے مندر کا گھنٹہ ہے۔

وہ شب و روز اسے اپنے ہاتھ سے بجایا کرتے تھے۔ یہ پلنگ فلاں نواب نے اپنی فلاں چہیتی رنڈی کے لئے بنایا تھا۔ یہ پنکھا فلاں مغل شہزادی یا رانی کا ہے اگر یہ سب سچ بھی ہو تو یہ چیزیں لکھنؤ کے عجائب گھر میں رکھی جانا چاہیئے۔ اور اگر یہ جھوٹ ہے تو ہماری روحانی غلاظت کی اس سے بہترین مثال اور کوئی نہیں ہو سکتی

کہ ہم اپنی اسلاف پرستی کو ذاتی منفعت کا وسیلہ بنا رہے ہیں اور اپنی رانیوں اور شہزادیوں کے پلنگ ان امریکی سیاحوں کے ہاتھوں بیچ رہے ہیں جو رات کو ان پر سوتے ہوئے ایک ایسے ذہنی تلذذ سے آشنا ہوتے ہیں۔ جو ہر ہندوستانی کے لئے بے حد شرمناک ہے۔

جو لوگ اناؤ سے سیر کرنے کے لئے آتے ہیں وہ لکھنؤ کو ایک عظیم الشان شہر سمجھتے ہیں وہ لوگ کلکتے سے بمباری کے خوف سے بھاگ کر یہاں پہنچے ہیں انہیں لکھنؤ ایک قصبہ معلوم ہوتا ہے جو انگریز سیاح عورت یہاں جنگی مصلحتوں کی بناء پر رک گئی ہے اور اپنے وطن نہیں جا سکتی ـــ وہ لکھنؤ کو ایک عجائب گھر سمجھتی ہے حقیقت یہ ہے کہ لکھنؤ نخاس ہے اور نخاس ہندوستان ہے وہ نہ ایک شہر ہے نہ دیہات، نہ عجائب گھر۔ وہ ایک بہت بڑا نیلام گھر ہے جہاں ہماری روح اور ہماری تہذیب اور تمدن اور وراثت کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے اسے اجنبی کے ہاتھوں بیچا جا رہا ہے یہاں نہ صرف ہمارا ماضی بکتا ہے بلکہ ہمارا حال اور مستقبل بھی ـــ آیئے ذرا نعیم گھوسے لئے۔

لکھ پتی بننے کا نسخہ

جب میں آٹھویں میں چوتھی بار فیل ہوا تو گھر سے ایک ہزار روپے اور کچھ زیور چرا کر بمبئی بھاگ آیا۔ یہاں تین مہینے میں ٹائپنگ کا کام سیکھ کے میں نے ایک دفتر میں عرضی داغ دی۔ کمپنی کا مالک میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔

"مگر ہم کو تو ایک لڑکی چاہیئے ——"

میں نے کہا —— "آج کل لڑکی اور لڑکے میں زیادہ فرق تو نہیں رہا۔ لڑکیاں پتلون پہنتی ہیں۔ میں بھی پہنتا ہوں، لڑکیاں بش شرٹ نما بلاؤز پہنتی ہیں۔ میں بلاؤز نما بش شرٹ پہنتا ہوں ان کے بال کٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ میرے بال بھی کٹے ہوئے ہیں پھر میں کس طرح کسی لڑکی سے کم ہوں"

کمپنی کے مالک نے میرے سامنے میری عرضی کے چار ٹکڑے کر دیئے اور بولا۔

"تم احمق ہو ــــ چلے جاؤ ــــ"

میں چلا آیا ــــ پھر میں تین مہینے کا کورس لے کے بجلی کے پنکھوں کی مرمت کا سیکھا اور کام سیکھ کر ایک کمپنی میں عرضی دی جو یہی کام کرتی تھی۔

کمپنی کا مالک بولا

"کیا بجلی کے پنکھے کے پُرزے توڑ سکتے ہو ــــ؟"

"جی نہیں ــــ جوڑ سکتا ہوں۔"

"کیا تم بجلی کے پنکھے اس طرح جوڑ سکتے ہو کہ ہر تیسرے مہینے پھر ان کی مرمت کی ضرورت پڑ جائے۔"

صاحب نے پھر پوچھا

"جی نہیں ــــ" میں نے فخریہ لہجے میں کہا۔ میں تو بجلی کا پنکھا ایسا عمدہ مرمت کر کے دوں گا۔ کہ ایک سال تو اس کا ایک پرزہ تک خراب نہ ہوگا"

"تو پھر تم ہمارے کام کے آدمی نہیں ہو ــــ صاحب نے جواب دیا اور میری عرضی کے آٹھ ٹکڑے کر دیئے۔

اس کے بعد ماسٹر کچل اسٹیل مل کے دفتر میں گیا اور بڑے صاحب سے جا کر بولا

"مجھے کام چاہیئے۔"

"کیسا کام" بولے

"کیسا بھی کام ہو میں کروں گا ــــ"

میں نے جواب دیا

وہ بولے "مگر تم کیا کام کر سکتے ہو ــــ؟"

میں بولا۔ "میں فرش جھاڑو دینے کے کام سے لے کر آپ کے دماغ میں جھاڑو پھیرنے تک کا کام کر سکتا ہوں۔

میرا جواب سن کر وہ مسکرائے بولے

" تمہارے جواب سے معلوم ہوتا ہے تم سیٹھ کستوری چند کے داماد ہو۔"

میں نے کہا۔ "جی نہیں۔"

وہ بولا۔ "تو پھر تم ضرور دھتوری چند کے نواسے ہو"

میں نے کہا۔ "میں بھی وہ نہیں ہوں۔"

وہ بولا۔ "تو پھر ضرور تم سیٹھ فتوری چند کے میرے بھائی کے خلیرے بھائی کے چچیرے بھائی کے پھپھیرے بھائی کے ....

اس کا دم پھول گیا۔

میں نے کہا۔ "جی میں وہ بھی نہیں ہوں"

تو کڑک کر بولا۔ تو پھر تم یہاں کیا کرتے۔ "گیٹ آوٹ"

گیٹ آوٹ ہو کر میں چلنے لگا۔ اور چلتا رہا۔ اور سوچتا رہا۔ کہ اب کیا کروں۔ ماں کے زیور ختم ہو چکے تھے اور ایک ہزار میں سے صرف ایک بارہ روپے بچے تھے۔

چلتے چلتے سہ پہر کے قریب مجھے سخت بھوک تو میں ایک سپورٹس کی دُکان میں گھس گیا۔ دکان میں کرکٹ، ہاکی، فٹ بال اور ٹینس کے سامان کے ساتھ ساتھ کانچ کے ایک خوبصورت برتن میں گول گول سفید رس گلے رکھے تھے میں نے ان کی طرف کر کے دکاندار سے کہا۔

"بڑے احمق ہو ــــ سپورٹس کی دوکان میں رس گلے رکھتے ہو ــــ؟"

وہ بولا ــــ "یہ بمبئی ہے۔ یہاں سب کچھ چلتا ہے ــــ"

میں نے کہا۔

"مجھے دو روپے کے رس گلے دو ــــ"

اس نے دو روپے کا کاغذ کے برتن میں سے دو رس گلے نکالے۔

وہ بولا ــــ "یہ اسپیشل ٹائپ کے رس گلے ہیں۔"

"تو چار دے دو ــــ"

اس نے مجھے ایک لفافہ میں چار روپے کے چار رس گلے دیئے۔ لفافہ لے کر میں باہر نکل آیا ــــ آگے بڑھا تو ایک جوہری کی دوکان پر بڑے عمدہ کیلے نظر آئے۔ ہرے ہرے اور خوب موٹے تازے چمکتے ہوئے۔

میں نے کہا۔

"عجیب آدمی ہو جوہری کی دوکان پر کیلے رکھتے ہو ــــ"

اس نے جواب دیا۔

"سونا بیچنا منع ہے اس لئے کیلے رکھتا ہوں"

"کیا بھاؤ دو گے ــــ"

میں نے پوچھا

"چھ روپے درجن ــــ"

"چھ روپے درجن ــــ!" میں نے حیرت سے چلّا کر کہا۔ "بارہ آنے کے بھاؤ سے بازار میں جتنے کیلے چاہو خرید لو ــــ"

"مگر یہ اسپیشل ٹاپ کے لیے ہیں"

"اچھا۔ تو ایک درجن دے دو"

اس نے ایک درجن کیلے ایک بڑے سے لفافے میں ڈال کر میرے حوالے کئے میں دوکان سے باہر نکل آیا۔ اور میٹرو سینما کے سامنے کے میدان میں چلا گیا کہ کھلی دھوپ اور گھاس پر بیٹھ کر اپنا کھانا کھاؤں۔

گھاس پر ایک کونے میں دوسرے لوگوں سے الگ تھلگ ایک جگہ تلاش کر کے میں وہاں بیٹھ گیا۔ پہلے میں نے رس گلے والا لفافہ کھولا اور ایک رس گلا نکال کر منہ میں ڈالا منہ میں ڈالتے ہی کچ کی سی آواز پیدا ہوئی اور مجھے معلوم ہوا کہ جسے میں رس گلا سمجھا تھا وہ دراصل پنگ پانگ کی ایک گیند تھی ربر کی بنی ہوئی۔

میں نے مایوس ہو کر جلدی سے دوسرا لفافہ کھولا۔ معلوم ہوا کہ اس لفافے کے اندر جتنے کیلے تھے وہ سب پلاسٹک کے بنے ہوئے تھے ـــــ اب کیا کیا جائے ـــــ؟"

"اب کیا ہو سکتا ہے۔"

میں نے سوچا ـــــ پیسے تو میں خرچ کر چکا ہوں ـــــ اب تو جو کچھ مل گیا ہے خدا کا شکر ادا کر کے کھا لینا چاہیئے۔ اور اوپر سے پانی پی لینا چاہیئے۔ چنانچہ میں نے ربڑ کے رس گلے اور پلاسٹک کے کیلے چبا چبا کے کھا ڈالے۔ کیونکہ رزق کی بے عزتی نہیں ہو سکتی اور رزق ہی کے لئے تو میں بمبئی آیا تھا کھاتے ہی مجھے بے حد پیاس لگی۔ اور پیٹ میں عجیب سی اینٹھن ہونے لگی۔

اتنے میں قریب سے ایک چھوکرا گزرا اس کے ہاتھ میں ایک میلا سا تھیلا تھا اس نے قریب آکر بڑے دھیرے سے کہا۔

"پانی پی لو ــــ دو روپے میں باٹلی ــــ"

میں نے اسے اپنے قریب بلایا اور اس سے پوچھا

"کیا لوٹ پڑی ہے بمبئی میں ــــ پانی کی باٹلی دو روپے میں بیچتے ہو"

وہ بولا۔

"یہ جوزف کا پانی ہے"

"جوزف کون ہے؟" میں نے اس سے پوچھا

"ہمارا مالک ہے" وہ بولا

"تو دو روپے میں پانی کی ایک باٹلی کیوں بیچتے ہو؟ جب کہ لاگنوز کا ادّہ چھ آنے میں ملتا ہے۔؟"

"مگر یہ اسپیشل ٹاپ کا پانی ہے۔ پہلی دھار کا ــــ" وہ بولا

میں نے پہلی دھار کا پانی آج تک نہیں چکھا تھا چلو آج یہ بھی ہو جائے جیب میں ایک سو کے نوٹ کے علاوہ ابھی دو روپے باقی تھے لہٰذا ایک باٹلی خرید کر حلق میں انڈیل لی ــــ حلق میں جاتے ہی ایسا لگا جیسے چودہ طبق روشن ہو گئے دماغ میں جتنے جالے تھے۔ سب صاف ہو گئے۔ ہر چیز روشن اور واضح اور اپنی صحیح صورت میں دکھائی دینے لگی

میں ایک جمپ لگا کر اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھا اور سو کے نوٹ کو اپنی مٹھی میں لے کر سیدھا کالبا دیوی روڈ کے کاٹن ایکسچینج کے اندر عجب بھگدڑ مچی تھی

غل غپاڑہ۔ نوچ کھسوٹ لوگ ایک دوسرے کے قریب ایک فٹ کے فاصلے پر کھڑے ہو کر بھی اس طرح چلاتے تھے جیسے ان کا مخاطب ان سے ایک سے ایک ہزار گز کی دوری پر ہو۔

وہ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے ——

" لیا۔ دیا — بیچا —— خریدا —— منڈی چڑھتی —— سات اوپر آٹھ نیچے چالیس ہزار گانٹھیں۔ ستر ہزار گانٹھیں —— ڈیڑھ لاکھ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

" دو لاکھ —— "

میں غصے سے چلایا

ایک دلال میرے پاس آیا۔

" بولا بیچتے ہو —— "

" ہاں بیچتا ہوں —— " میں نے غرا کر کہا۔ اور خریدتا بھی ہوں "

" کس بھاؤ سے —— "

اس نے مجھے شانے سے پکڑ لیا تاکہ میں بھاگ کر کسی دوسرے دلال کے پاس نہ چلا جاؤں

" سات اوپر نو نیچے —— " میں نے بلند آواز میں کہا

" سات اوپر نو نیچے —— " وہ خوشی سے چلایا

جیسے میری بات کا اسے یقین نہ آیا ہو۔

" ہاں سات اوپر نو نیچے —— " میں نے دہرا کر کہا۔

دلال خوشی سے چلایا —— " دو لاکھ گانٹھیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دو لاکھ گانٹھیں۔ "

پھر ایک دم رک کر میری طرف دیکھ کر بولا۔
"کس کی۔"
"عقل کی ـــ"
"عقل کی ـــ" کوئی نیا برانڈ ہے روٹی کا ـــ"
اس نے میری طرف شبہ کی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا
"اسپیشل ٹائپ کا برانڈ ہے ـ" میں نے جواب دیا
"اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ٹٹولتے ہوئے کہا۔"
"تم چرٹے رام اینڈ کمپنی کے آدمی ہو نا۔"
" اور کس کا دکھائی دیتا ہوں ـــ" میں نے گرج کر پوچھا
"پہچانتے بھی نہیں ہو ـ"
اس نے میرا کندھا تھپتھپا کر کہا ـــ "ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔ صاحب جی جرا کھاتری کرلینا اچھا ہوتا ہے"
پھر وہ مجھے چھوڑ کر آگے بڑھ گیا اور اپنے سے تین فٹ کے فاصلے پر کھڑے ہوئے آدمی کے کان میں پورا حلق پھاڑ کر بولا
"دو لاکھ گانٹھیں چرٹے رام اینڈ کمپنی ـــ دو لاکھ گانٹھیں۔ . . . . سات اوپر نو نیچے!
" اور بیچ میں صفر ـــ" وہ چلاتا ہوا آگے بھیڑ میں غائب ہو گیا۔
میں کوئی آدھے گھنٹے تک میں بھیڑ کے کنارے باہر کھڑا یہ غل غپاڑہ دیکھتا رہا۔" اور جب میں مایوس ہو گیا کہ وہ دلال واپس نہیں آئے گا۔ تو میں باہر جانے

کے لیے مڑا اتنے میں وہ دلال بھیڑ کو چیرتا ہوا دوڑتا دوڑتا میرے پاس آیا اور آکر اس نے میرے ہاتھ میں باسٹھ ہزار روپے کے نوٹ تھما دیئے بولا

"میں نے اس میں سے کمیشن کی کٹوتی نہیں کی ہے"

میں نے کہا۔

"تو کر لو نا —"

"سیٹھ کو بولے بغیر —" اس نے ذرا حیرت سے پوچھا

"میں سیٹھ کو بول دوں گا — وہ پونا گیا ہے"

"اچھا تو دو ہزار دے دو۔"

دو ہزار کٹوتی کے دے کر میں ساٹھ ہزار لے کر کاٹن ایکسچینج کے باہر ٹیکسی میں بیٹھ کر میں نے ٹیکسی والے سے کہا۔

"چلو بمبئی کے باہر کہیں بھی چلو اور دل میں سوچا کہ چرنٹ رام اینڈ کمپنی اور میرے درمیان جتنا فاصلہ بھی یہ ٹیکسی پیدا کر دے اتنا ہی اچھا ہے۔

باندرہ کے قریب پہنچ کے مجھے بڑے زور سے پیشاب لگا۔ پھر ٹیکسی کے فرش پر نگاہ ڈالی مگر ٹیکسی ڈرائیور ایک بھاری بھرکم بڑی بڑی مونچھوں والا پٹھان تھا اس لئے میں گھٹنے دے کر بیٹھ گیا اور ٹیکسی والے سے کہا۔

لنکنگ روڈ پر سڑک کے دو رویہ بہت سے پلاٹ خالی تھے۔ یہاں ابھی تک بلڈنگیں نہیں بنی تھیں۔

ٹیکسی والے نے شہہ پاکر زور سے ٹیکسی بھگائی۔ ایک خالی پلاٹ کے قریب جاکر میں نے کہا۔

"ٹیکسی روک دو ــــ"

ٹیکسی رکتے ہی میں تیر کی طرح ٹیکسی سے نکلا اور بھاگتا ہوا خالی پلاٹ کے اندر چلا گیا اندر جاتے ہی ایک آدمی میرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا شکل وصورت سے وہ سندھی معلوم ہوتا تھا۔

"تم کیا پلاٹ خریدنے کو آیا ہے ــــ"

اس نے مسکرا کر پوچھا

"ہاں ــــ" میں نے جلدی سے کہا۔ مگر آگے سے ہٹ جاؤ ذرا ــ"

"کتنے میں دوگے۔"

وہ پھر میرا راستہ روک کر بولا۔

"جتنے میں دے دو ــــ میں نے کہا ــــ" مگر میں بہت جلدی میں ہوں اسوقت آگے سے ہٹ جاؤ۔ ذرا مجھے فارغ ہو لینے دو۔"

"وڑی اتنی جلدی کیسے فارغ ہو جائے گا ــــ" وہ سندھی اپنی باچھیں کھلاتے ہوئے بولا ــــ یہ پلاٹ سیٹھ شروانی کا ہے ڈیڑھ میں ملے گا۔ پچیس ہزار روپے ایڈوانس لے گا۔ ہم آج ایڈوانس دے کر سودا پکا کر جاؤ وڑی باقی دے دینا ہم سیٹھ شروانی کو۔۔۔۔۔۔

"ابے زیادہ شروانی مت کر مجھے تکلیف ہوتی ہے۔۔۔"

بے قرار ہو کر چلایا اور جیب سے پچاس ہزار کے نوٹ نکال کر بولا

"یہ لے پچیس ہزار روپے ایڈوانس کے اور راستے ہٹ مجھے پلاٹ دیکھنے دے۔" میں نے جلدی سے اسے پچیس ہزار روپے دیئے اور پلاٹ میں پیشاب کیا

اس کے بعد سیٹھ شروانی کا ایجنٹ مجھے اپنے آفس میں لے گیا۔ اور اس نے پچیس ہزار کی رسید مجھے دے کر کہا۔

"یہ رسید لے جاؤ کل تین بجے باقی روپیہ لے کر آجاؤ۔ کل تین بجے ہمارا شروانی ادھر آئے گا۔ پلاٹ کا کانچ تمہارے حوالے کرے گا۔"

میں نے بادل نخواستہ رسید لے لی۔ اب کیا ہو سکتا تھا۔ میں نے پچیس ہزار میں پیشاب کیا تھا ــــ

دنیا کا سب سے مہنگا پیشاب!

پلاٹ خریدنے کے لئے باقی روپے میرے پاس کہاں تھے اس لئے میں نے رسید جیب میں ڈال لی اور کل آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہونے ہی والا تھا کہ دفتر کے باہر ایک کار آئی اور موٹا گندمی رنگ کا آدمی زرد ٹریلین کا سوٹ ڈالے ہوئے بھاگتا بھاگتا اندر آیا اور ہانپتے ہانپتے بولا۔

"او گلڈ وانی ــــ ڈی نمبر فائیو کا پلاٹ بیچا تو نہیں تو نے"

گلڈ وانی سر سے پاؤں تک مسکراہٹ بن گیا

پچیس ہزار کے نوٹ اس آدمی کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولا

"سودا ہو گیا۔ پچیس ہزار ایڈوانس بھی مل گیا۔ سیٹھ یہ لو ــــ"

"کتنے میں بیچا۔"

"وڈی جتنے میں آپ نے بولا تھا ــــ پورے ڈیڑھ لاکھ میں ایک کم نہ ایک زیادہ ــــ"

اس آدمی نے اپنا ماتھا پیٹ لیا۔ بولا۔"

"وہ سیٹھ فول چند کو ادھر سینما بنانے کا پرمٹ مل گیا ہے وہ ادھر سینما باندھے گا۔ چار لاکھ میں پلاٹ لیتا ہے۔ ہمارا ——"

"ہم تو اسے دے چکا ——"

سیٹھ شروانی گلڈوانی کے چہرے کا بلب بجھ گیا۔

"اوہ! سیٹھ کے منہ سے بے اختیار مایوسی کے لہجے میں ایک گہری آہ نکلی پھر اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ایک کرسی پر گرا دیا اور خود قریب میں ایک کرسی کھینچ کر بولا۔

"سیٹھ ہمارا نقصان مت کرو یہ سودا کٹ کردو"

"کیوں کروں ——"

میں نے بڑی سختی سے انکار کر دیا۔

"ہم تم کو اس سے ایک ہزار اور جاتی زمین کا پلاٹ ادھر باجو میں دیتا ہے ——"

"نہیں ہم کو یہی زمین چاہیئے ——"

میرے لہجے میں چابک کی سی تیزی تھی۔

سیٹھ شیروانی بے بسی سے میری طرف دیکھنے لگا ہم تم کو پچیس ہزار کے پچاس ہزار اپنی طرف سے واپس کرتا ہے ..... پورے پچاس ہزار....."

"ہم کو پچاس ہزار نہیں چاہیئے یہی زمین چاہیئے۔"

"اچھا ساٹھ ہزار لے لو۔"

"نہیں ——"

"ستر ــــ"

"نہیں۔"

"تو کیا لوگے تم ــــ"

شروانی اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھنے لگا۔ اس کے چہرے سے ایک ایسی عجیب سی بو آرہی تھی جو ان پیسوں سے آتی ہے جو بہت دیر تک کسی کی مٹھی میں دبے رہیں۔

"ففٹی ففٹی ــــ" میں نے کہا۔

"ففٹی ففٹی کیا ــــ؟" وہ انجان بن کر بولا

میں نے کہا۔

"تم اس زمین کی قیمت ڈیڑھ لاکھ لگا رہا تھا مگر اب تم کو اس کا چار لاکھ ملتا ہے اس لئے ڈیڑھ لاکھ کے اوپر جو تم کو منافع ملتا ہے وہ آدھا تم لے جاؤ آدھا ہم کو دے دو ــــ"

سیٹھ شروانی نے چند لمحوں تک تیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا پھر اس نے میرے پچیس ہزار کے نوٹ اپنی جیب میں ڈال لئے پھر اندر کی جیب ٹٹول کر اس میں سے ایک بٹوا نکال کر ایک لاکھ کے نوٹ نکالے۔ پھر سوا لاکھ میرے ہاتھ میں تھما کر بولا ــــ

"سیٹھ تمہاری تقدیر اچھی تھی یہ لے جاؤ پھوٹ میں ــــ اور میری زمین چھوڑ دو ــــ"

میں سوا لاکھ جیب میں ڈال کر وہاں سے چلا آیا۔

بچپن میں مجھے اپنے گاؤں میں برف کے گولے بنانے کا بہت شوق تھا جب برف پڑ کر تھم جاتی تھی تو میں گھر کے باہر گھاٹی پر نکل کر برف کا گولا بنا کر اسے گھاٹی پر لڑھکاتا تھا برف کا گولا بڑی تیزی سے لڑھکتا جاتا تھا اور آس پاس کی برف کو اپنے اندر سمیٹتے ہوئے بڑا ہوتا جاتا تھا۔ یہی حال روپے کا ہے ایک لاکھ ساٹھ ہزار روپے کا گولا بنا کر میں نے جو اسے بمبئی کی گھاٹی بنا کر لڑھکانا شروع کیا تو روپے کے ساتھ روپیہ ملتا چلا گیا اور اب تو اتنا بڑا گولا بن چکا ہے کہ میرے سنبھالے بھی نہیں سنبھلتا۔ آج کل میرا شمار بمبئی کے بڑے بڑے لکھ پتیوں میں ہوتا ہے۔

چند دن ہوئے مجھے بھاگرا یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف فلاسفی کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ ڈگری دیتے وقت وائس چانسلر نے مجھ سے درخواست کی کہ میں لڑکوں کو اپنی کامیابی کا راز بتاؤں تقریر کرتے وقت میں نے طلباء سے کہا۔

" لکھ پتی بننے کا صرف ایک ہی نسخہ ہے۔ محنت کرو۔ محنت کرو اور ایمانداری سے جیو۔"

مجھے امید ہے کہ یونیورسٹی کے طالب علم اور اس قصبے کے پڑھنے والے ضرور میری نصیحت پر عمل کریں گے اور بڑے اچھے کلرک ثابت ہوں گے۔

ننگا رہنے پر

پرسوں بیکاروں کے کلب میں ایک چیک جنٹلمین سے ملاقات ہوگئی۔ یہ چیک عریانیت کی تحریک کا حامی معلوم ہوتا تھا اس نے جیسا کہ عریانیت پسندوں کا عام قاعدہ ہے ایک عمدہ بریڈفورڈ سوٹ پہن رکھا تھا اور منہ میں ایک قیمتی سگار دبا رکھا تھا۔

عریانیت کے اصولوں کی تشریح کرتے ہوئے کہنے لگا ـــــ خوبصورتی دو طرح کی ہوتی ہے ایک خوبصورتی وہ ہے جو خدا پیدا کرتا ہے اور دوسری وہ جو درزی عطا کرتا ہے۔ انسان کا ناشکرا پن دیکھو کہ حسنِ خداداد کو چھوڑ کر درزی کی مصنوعی خوبصورتی کا سہارا تلاش کرتا ہے

چیک جنٹلمین دیر تک عریانیت کے متعلق گفتگو کرتا رہا۔ پچھلے چند ہفتوں سے

عریانیت پسندوں کے متعلق کتابیں پڑھ رہا تھا۔ اور اس دلچسپ تحریک کے متعلق واقفیت حاصل کر رہا تھا۔ اس ملاقات سے رہی سہی کسر پوری ہوگئی اور میں عریانیت پر ایمان لے آیا۔ ایک روحانی انقلاب سمجھئے جسمانی نہیں ــــ کیونکہ جسم تو ایک فروعی ناپائیدار سی شے ہے اصل چیز تو روح ہے اور وہ بھی ایک ہندوستانی کی رُوح۔

لیکن میرے اکثر احباب جن کا نفسیاتی ماحول قرونِ وسطیٰ سے آگے نہیں بڑھ سکا میرے اس نئے عقیدے کو شبہ کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور اکثر پوچھ لیتے ہیں۔

"کیوں صاحب آپ کو ننگا رہنے میں کیا فائدہ نظر آتا ہے ــــ یہ سوال کرتے وقت اوّل تو وہ دیکھتے ہی نہیں کہ میں کپڑے کیوں پہنے ہوئے ہوں اور اگر خود کپڑے پہنتا ہوں تو دوسروں کو کپڑے اتارنے کی تلقین کرتا ہوں۔ کیا اس میں میری شریر طبیعت کو کوئی دخل ہے۔

لیکن بحث کے شوق نے اکثر احباب کو اس قدر اندھا کر دیا ہوتا ہے کہ وہ میرے جسم پر کپڑے نہیں دیکھ سکتے اور مجھ پر عریانیت کی حمایت کرتے ہوئے دیکھ کر فوراً ہی سوال کر دیتے ہیں۔

"کیوں صاحب آپ کو ننگا رہنے میں کیا فائدہ نظر آتا ہے"

اور میں اپنی سیاہ شیروانی ..... میرے پاس ایک ہی ہے دو موقعوں پر ہی استعمال کرتا ہوں۔

۱۔ مشاعرے میں نظم پڑھتے وقت۔

۲۔ مفت سینما دیکھتے وقت۔"

میں اپنی سیاہ شیروانی کے بٹن بند کرتے ہوئے نہایت اطمینان سے جواب دیتا ہوں ــــ۔

"جی ..... میں تو ننگا رہنے میں کوئی فائدہ نہیں دیکھتا"

"ارے ــــ" وہ چلا کر کہتے ہیں ــــ" اگر میں غلطی نہیں کرتا تو ــــ"

"جی ہاں آپ بلاشبہ غلطی پر ہیں ــــ" میں دل جمعی سے جواب دیتا ہوں۔ یہ میں نے نہیں کہا۔ کہ میں ننگا رہنے میں کوئی فائدہ دیکھتا ہوں ــــ ہاں یہ سچ ہے کہ میں ننگا رہنے والوں کی حمایت ضرور کرتا ہوں۔"

"تو پھر ــــ" آپ گھبرا کر پوچھتے ہیں ــــ" آپ کا منشا کیا ہے۔ میں بالکل نہیں سمجھ سکا۔

"کیسے سمجھ سکو گے؟ میں جواب دیتا ہوں ــــ" ذرا سوچیے تو سہی آپ لوگ اس مہاجنی زور کے پرستار ہیں آپ کے دل دماغ پر اسی چیز کا تسلط ہے مہاجنی نظام کی بنیاد فائدہ ہے اگر کسی چیز میں فائدہ ہے تو اچھی ورنہ بُری اگر صنعت چلائی جاتی ہے تو فائدے کے لئے خیرات کی جاتی ہے تو وہ بھی فائدے کے لئے۔ ہمارا نام ہوگا، اخباروں میں شہرت ہوگی، ہماری ساکھ بنے گی۔ ساکھ کے ساتھ تجارت اور تجارت سے فائدہ ــــ بس یہاں ہر چیز کی کسوٹی فائدہ ہے آپ یقین مانئے عرمانیت پسندوں کے کامیاب ہو جانے پر حکومت سب سے پہلے جو کام کرے گی وہ یہ ہے کہ اس لفظ "فائدہ" کو لغت سے خارج کر دے گی۔

حیرت ہے کہ ہم لوگ ہر چیز کو اس زاویہ نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں اس میں فائدہ ہے ــــ کوئی فائدہ ہے ــــ؟ کتنا فائدہ ہے؟ کیوں کر فائدہ ہے؟

نتیجہ یہ ہے کہ ہم اس فائدے کے چکر میں خوکشی کو گنوا بیٹھے ہیں اس لئے کہ آخر خوش رہنے میں فائدہ ہی کیا ہے

مسرت ایک بے فائدہ اور بے اختیاری سا جذبہ ہے اور مہاجنی کے اندھے چکر میں پڑکر ہم یہ بھی نہیں سوچ سکتے کہ دنیا میں ایسی کتنی ہی بے فائدہ چیزیں ہیں جو ہماری زندگی کا حسن و عظیم ہیں اور آخر ان بے فائدہ باتوں کے سوچنے سے کیا حاصل۔ یہی وقت اگر کوک شاستر پڑھنے یا نفیس نفیس ریشمی ساڑھیاں فروخت کرنے پر صرف کیا جائے تو کتنا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے

بیشک بیشک آپ فائدہ حاصل کیجئے ـــــ یوں ہی ننگا رہنے کی بے فائدہ تحریک پر بے فائدہ بحث کرنے سے کیا فائدہ .....؟

اور میرے دوست غصے میں آکر کہتے ہیں ـــ

"آپ نے تو یوں ہی اس فائدے کے لفظ سے کھینچا تانی شروع کر دی۔ ہم نے تو یونہی سرسری طور پر پوچھا تھا۔ کہ ہم آخر ننگے کیوں رہیں۔"

اور میں اپنے دوست سے پوچھتا ہوں کہ آخر ہم ننگے کیوں رہیں اور مجھ سے اگر صاف صاف پوچھتے ہو تو اس تحریک سے میری ہمدردی کا باعث وہ نفرت اور غصہ ہے جو مجھے اپنے درزی کے خلاف ہے میں ننگا رہنا اس لئے پسند کرتا ہوں کہ میں اپنے درزی کا بل ادا کرتے کرتے تنگ آ گیا ہوں۔ گو مجھے اس امر کا بھی احساس ہے کہ اسے ہمیں انسان بنانے میں کافی محنت اور مشقت کرنی پڑتی ہے ذرا میری اس سیاہ شیروانی کی طرف دیکھئے کتنی اچھی سلی ہے اگر میں اسے نہ پہنے ہوئے ہوں تو مجھے کون انسان کہے گا۔ اور کون مجھے مشاعرے میں گھسنے دے گا۔؟

دراصل آپ لوگ بات کی تہہ تک نہیں پہنچتے۔ یا شاید پہنچنا ہی نہیں چاہتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک غیر شعوری اضطراری خوف آپ کو ہر وقت دبائے رکھتا ہے آپ کے دل و دماغ پر ہر وقت مسلط رہتا ہے اور وہ یہ خوف ہے کہ مبادا آپ کو کوئی حیوان کہہ دے دوسرے دو پایوں یا چوپایوں کی طرح آپ بھی ننگے ہی پیدا ہوئے۔ مدتوں ننگے رہے پھر کھیل ہی کھیل میں درختوں کی چھال اوڑھ لی۔ جس طرح جنگل کے بندروں نے ایک بار کھیل ہی کھیل میں غریب سوداگر کی ٹوپیاں لوٹ کر اپنے سروں پر رکھ لی تھیں اور آج یہ حالت ہے کہ پاؤں کے ٹخنوں تک کو جرابوں میں چھپا دیا ہے۔ مبادا انہیں ننگا دیکھ کر کوئی جانور کہہ دے اور حقیقت پر سے نقاب اٹھ جائے

بس یہی خوف و ہراس ہر وقت آپ کی روحوں کو اسیر اور آپ کے جسموں کو کپڑوں کا غلام بنائے رکھتا ہے غریب ڈارون کی مخالفت بھی محض اسی وجہ سے ہوتی ہے اور ننگا رہنے والوں پر جو پھبتیاں کسی جاتی ہیں ان کی اساس بھی یہی خوف ہے

"ہائیں — کیا ہم جانور ہیں —؟ کیا ہم حیوان ہیں —؟ کیا ہم بندر کی ارتقائی منزل ہیں۔؟

مجھے انسان کے اشرف المخلوقات ہونے سے انکار نہیں۔ لیکن میں اسے غلط سمجھتا ہوں اگر ہم کپڑے نہ پہنیں تو اشرف المخلوقات نہیں رہیں گے انسان اور حیوان میں جہاں بہت قریب کا تعلق ہے وہاں بہت سی باتوں میں فرق بھی ہے لیکن یہ فرق کپڑے پہنیں جیسا کہ عام لوگ خیال کرتے ہیں ان لوگوں میں ہمارے مغربی

بھاتی بھی شامل ہیں۔ یہاں مجھے اُن میم صاحب کی مذبوحی حرکات یاد آتی ہیں جو اپنے کتوں، بلیتوں اور مینا ؤں کو کوٹ، فراک اور کانوں میں بالیاں پہنا کر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتی ہیں کہ یہ عام کتے بلیاں اور مینائیں نہیں۔ بلکہ اُن سے الگ تھلگ اور انسانوں سے ملتی جلتی کوئی دوسری نسل ہے اور آج کل تو ان کپڑوں کا رواج اس قدر بڑھ گیا ہے کہ ہر شخص اعلےٰ سے اعلےٰ اور مکلّف سے مکلف لباس پہن کر گویا انسانیت کی معراج تک پہنچنا چاہتا ہے

کتنی مضحکہ خیز حالت ہے یہ صریح دھوکہ نہیں تو اور کیا ہے اگر میں گاڑھے کا تہمد باندھ کر بازار سودا سلف لینے جاؤں تو مجھے کوئی دو پیسے کا ادھار دینے کا روا دار نہیں۔ لیکن اگر " فوق البھڑک" کپڑے پہن کر نکلوں تو دوکاندار خوشی سے بیسیوں روپیہ کا ادھار کر لیتا ہے مجھے یقین ہے کہ اگر میں کسی مشاعرے میں ننگا چلا جاؤں تو خبطی اور سودائی سمجھ کر ہال سے باہر نکال دیا جاؤں گا۔ لیکن اگر سیاہ شیروانی زیب تن ہو۔ تو پھر دیکھیے مشاعرے کے منتظم کس طرح جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔

آئیے صاحب آئیے! ادھر تشریف لائیے۔ آگے آئیے —— اس کرسی پر بیٹھئے —— وہ وہ خاطریں ہوتی ہیں کہ میں دیکھ دیکھ کے دل میں کڑھتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ یا اللہ میں شاعر ہوں یا میری شیروانی۔؟

بعض سیدھے سادے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ کپڑے انسان کی خوبصورتی کو بڑھاتے ہیں۔ یہاں میں وہ نہیں دہرانا چاہتا جس کا مطلب یہ ہے کہ "چاند گہنوں کے بغیر بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔"

لیکن میں یہ بات ضرور کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ان سیدھے سادھے لوگوں کا خیال بالکل غلط ہے۔

کپڑے دراصل اس لئے پہنے جاتے ہیں کہ لوگ اپنی بدصورتی کو چھپا سکیں جس طرح روحانی بدصورتی کو لوگ خیرات سے ڈھانپنے کی کوشش کرتے ہیں اسی طرح جسمانی بدصورتی کو چھپانے کے لئے خوشنما پوشاکیں پہنی جاتی ہیں۔ فوق البھڑک اچکنیں اور ساڑھیاں پہنی جاتی ہیں تاکہ بیمار جسم کی بیمار جلد پر نگاہ نہ پڑ سکے۔

چہرے پر غازہ تاکہ رخساروں کی زردی ڈھک جائے لبوں پر سرخی تاکہ بیمار خشک اور روکھے لب کسی کو متنفر نہ کر دیں۔ یہ کپڑے تو دھوکے کی ٹٹی ہیں اگر آپ لوگ واقعی صحت ور ہیں اور خوبصورت جسموں کے مالک ہیں تو اس کو چھ چھ گز لمبی ساڑھیوں یا اچکنوں میں چھپانے سے کیا حاصل

گلاب کی رعنائی یا دل کشی اس میں ہے کہ وہ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہنستا رہے اور اپنے حسن خداداد کے جلووں سے اس دنیا کو روشن کرتا رہے گلاب کی کلی، چنبیلی کا پھول، آسمان کی نیلاہٹ، شفق کا حسن۔ اگر ان تمام چیزوں کو کپڑوں کی ضرورت نہیں تو کیا عزت انسانی حسن کو کپڑوں کی حاجت ہے۔ کیا وہ سچ مچ اس قدر گندہ بو سیدہ اور مفلوک الحال ہو چکا ہے کہ اسے اپنی ہستی کو برقرار رکھنے کے لئے کپڑوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

میں کئی ایسے لوگوں کو بھی جانتا ہوں جو یوں تو عریانیت کے پرستار نظر آتے ہیں لیکن باطن سے بہت ڈرتے ہیں اور اکثر چلتے چلتے ان لفظوں میں اپنی کمزوری کا اقبال کر لیتے ہیں ــــ

"بھئی عریانیت تو ہے اچھی چیز ـــــ لیکن دراصل بات یہ ہے کہ ہمیں اپنے آپ کو ننگا دیکھ کر شرم سی محسوس ہوتی ہے" اور یہ شرم بالکل ٹھیک ہے۔ اور حالات کے مطابق کیونکہ انسان کی سرشت میں بدی اب اتنا گھر کر چکی ہے کہ وہ اپنے آپ کو عریاں دیکھنا مطلق پسند نہیں کرتے۔ چوری کرتے وقت شرم محسوس نہیں ہوتی اور دھوکہ دیتے وقت شرم محسوس نہیں ہوتی لیکن کپڑے اتارنے پر ضرور شرم محسوس ہوتی ہے۔ اور شاید یہ بھی سچ ہو ـــــ کیونکہ اب انسانی شرم کے لئے کپڑوں کے سوا اور کون سی جگہ رہ گئی ہے جہاں اُسے پناہ دی جا سکے۔

بزرگوں سے سنا کرتے تھے کہ انسان کی شرم اس کے دل میں اسکی آنکھوں میں رہتی ہے اب لے دے کے صرف کپڑوں میں رہ گئی ہے جہاں اسے پناہ دی جا سکے اگر یہ کپڑے بھی اتار لئے گئے تو وہ اسے کہاں رکھے گا۔ شائد موقع پاکر سستے بھاؤ بیچ دے۔ آخر مہاجنی دور ٹھہرا ـــــ آجکل کے فلسفۂ عریانیت میں جس چیز نے مجھے بہت متاثر کیا ہے اس کی ٹھوس بنیادی سچائی۔ اس امر سے انکار ہو سکتا ہے کہ خدا نے ہم سب کو ننگا پیدا کیا لیکن ہم لوگ اپنے عریاں حسن سے آہستہ آہستہ متنفر ہوتے گئے اور اسے کپڑوں میں چھپانے لگے۔ گیہوں شیطان یا حوا نے انسان کو اتنا گمراہ نہیں کیا تھا۔ جتنا کپڑوں نے۔ کپڑے انسانی صعوبتوں کا منبع ہیں اگر انسان کپڑے پہننا چھوڑ دے تو دنیا میں آج آشتی اور سادات کا دور دورہ ہو جائے بنی نوع انسان کی سب تکالیف دور ہو جائیں۔ نہ جنگیں ہوں نہ چھوت کی بیماریاں نہ درزی ـــــ بس ہر طرف چین ہی چین ہو۔ اسمبلی کے ارکین پارلیمنٹ میں موت کی شعاعوں پر بحث کرنے کی بجائے الٹرا وائیلٹ شعاعوں پر غور کیا کریں گے ماڈلین

نیشنل کانگریس سوراج سوراج کا پکارنا چھوڑ دے گی۔ کیونکہ اس وقت ہر شخص (خارجی طور پر ہی) چھوٹا موٹا مہاتما گاندھی بن چکا ہو گا۔ ہندوستان کے کروڑوں (ننگے آدمیوں) کا سوال سوال نہ ہوگا۔ بلکہ ایک حل یعنی ایک ایسی طے شدہ بات جس پر مزید غور کی ضرورت نہ ہو گی۔

اب اس خوبصورت تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے۔ کہنے کو تو یہ سب کچھ کہہ سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ دنیا میں عریانیت پسند اقلیت میں ہیں۔ انہیں نہ صرف درزیوں کا مقابلہ کرنا ہے۔ بلکہ ان تمام جماعتوں کا بھی جو اچھی کپڑے پہنتی ہیں اور سوتے جاگتے، چلتے پھرتے، نہاتے دھوتے عشق کرتے۔ غرضیکہ ہر وقت فیشن کے مطابق کپڑوں میں ملبوس رہتی ہیں۔

ان کے علاوہ وہ لوگ بھی ہیں جو بظاہر نیم برہنہ حالت میں رہتے ہیں لیکن ہر لحظہ کپڑوں کی آرزو میں جلتے ہیں یہ اوسط درجے کے نیم برہنہ لوگ۔ بڑے ہی خطرناک ہوتے ہیں انہیں تحریک عریانی کا حامی نہیں دشمن سمجھنا چاہیئے۔ عریانیت پسندوں کو ان تمام منظم و مقتدر جماعتوں کے خلاف جنگ کرنا ہے اور کپڑوں کے ظلم سے دنیا کو نجات دلانا ہے میرا عقیدہ ہے کہ اس دنیا میں سچے اشتراکی صرف ننگے رہنے والوں کی جماعت میں پائے جاتے ہیں۔

نازیوں سے پہلے جرمنی میں اشتراکیت اور عریانیت کی تحریکیں بہت زوروں پر تھیں ہٹلر نے آتے ہی موقع کی نزاکت کو بھانپ لیا اور دونوں تحریکوں کو فوراً دبا دیا۔ ہمیں بھی وہی کرنا چاہیئے جو ہٹلر نے کیا۔ یعنی اشتراکیت اور عریانیت کو ایک ہی تحریک سمجھنا چاہیئے۔

ہمارے جنت نشاں میں عریانیت کی تحریک بہت پرانی ہے اور صدیوں سے چلی آتی ہے۔ ہندوستان میں کروڑوں آدمی ننگے رہتے ہیں۔ لاکھوں گھر ایسے ہیں جہاں سارے کنبے میں عورتوں کے پاس صرف ایک دھوتی ہی دھوتی ہے۔ جسے وہ باری باری گھر کے کام کاج کرنے میں استعمال میں لاتی ہیں۔ مرد، عورتیں بچے عادتاً ضرورتاً ننگے رہتے ہیں اور ساری عمر اس چمڑی میں گزار دیتے ہیں جس کے ساتھ وہ ماں کے بطن سے پیدا ہوئے تھے اس کی وجہ نہ ان کی غربت ہے نہ انگریزی راج کی برکت بلکہ محض قانون قدرت۔

ان کے علاوہ ہندوستان میں ایک بہت چھوٹی سی اقلیت ہے جس نے ہزار سال سے عریانیت کی شمع کو اپنے علم و فضل سے فروزاں کر رکھا ہے میرا اشارہ ناگوں کی طرف ہے۔ ناگے وہ بہادر، بے غرض فقیر لوگ ہیں جو اکثر کنبھ کے میلے پر دکھائی دیتے ہیں ان لوگوں نے اپنی پاکیزہ روایات اور بے مثل قربانی سے ہندوستان میں بھی عریانیت کی تحریک کو اس کی تمام سچائی اور خوبصورتی کے ساتھ زندہ رکھا ہے۔ جب تک ان لوگوں کا دم باقی ہے اس تحریک کے مٹ جانے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے یہ تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں ہندوستان میں لاکھوں کروڑوں ننگے رہتے ہیں لیکن یہ لوگ ناگوں کی طرح اس تحریک کی بنیادی روحانیت سے واقف نہیں اور شاید یہ لوگ ہر لحظہ یہی دعا کرتے رہتے ہیں کہ انہیں اور کپڑے ملیں تو یہ اپنے بال بچوں اور بیویوں کے جسموں کو کپڑوں سے ڈھک سکیں ان لوگوں کی ذہنیت خطرناک طور پر رجعتی اور بورژوائی ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ ان لوگوں کو کپڑے مہیا کئے جائیں بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ انہیں کپڑوں کے مضر تاثرات سے آگاہ کیا جائے۔ اس کے لئے لگاتار پروپیگنڈے

کی ضرورت ہے۔

مقام شکر ہے کہ ہندوستان کے رہنماؤں کی توجہ اب اس طرف منعطف ہوتی جاتی ہے پچھلے دنوں مہاراجہ آف جام نگر (مرحوم) نے ایک نہایت شاندار سولے ریم (Solarium) جام نگر میں تعمیر کرایا اسی طرح بمبئی کے بعض رئیسوں نے بھی ننگا رہنے کا ایک کلب قائم کیا ہے یہ ہے وہ سچی مساوات جسے صرف کوئی ننگا رہنے والا ہی دوبارہ زندہ کر سکتا ہے اور مجھے تو عریانیت کا مستقبل اور اس لئے انسان کا مستقبل بہت شاندار نظر آتا ہے اور میں تو باطن کی آنکھ سے وہ زمانہ دیکھ رہا ہوں کہ جب ننگا رہنے والے اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے جب اس دنیا میں ایک ننگا انقلاب آئے گا ایک برہنہ طوفان جو ہر قسم کے کپڑوں کو ان میں اونی سوتی ریشمی اور جاپانی ہر قسم کے کپڑے شامل ہیں خس و خاشاک کی طرح بہالے جائے گا۔ اور سب انسان قدرت کے حضور میں ننگے کھڑے ہوں گے۔ اور دنیا مکمل مساوات مکمل آزادی اور مکمل امن حاصل کرے گی۔

جمیلہ

خوبصورت عورت کا بڑھاپا، بجھے ہوئے آتش فشاں پہاڑ کی طرح ہوتا ہے اب لاوا برس چکا۔ آب و آتش کا طوفان گزر چکا۔ اب کریٹر کی تہہ میں کچھ گرم راکھ باقی ہے جس میں کبھی کبھی چند شرارے چمکتے ہیں۔ دلّی میں میں نے جمیلہ کی نوجوانی کا سراپا دیکھا تھا۔ اور اب لندن میں اس کا بڑھاپا دیکھ رہا تھا ــــ بیچ میں تیس سال تھے۔

"دلی کی وہ شام مجھے اکثر یاد آتی ہے ــــ" میں نے جمیلہ سے کہا۔ "جب میں نے تمہیں پہلی بار اور آخری بار انصاری کے گھر دیکھا تھا۔ تم نے جوتے اتار دیئے تھے اور غالیچے پر مٹک مٹک کر ٹہل رہی تھیں۔ یا یوں کہو کہ ٹہل ٹہل کے مٹک رہی تھیں۔"

"اب کچھ کہو —"

جلیسہ ایک اُداس تبسّم سے بولی

"مجھے اجازت دو کہ میں تمہارا سراپا بیان کر سکوں ۔ ذہنی سراپا کیونکہ خوبصورت عورت محض جسم ہی نہیں ہوتی وہ ایک تاثر ہوتی ہے بار بار مجھے تمہارے جسم کا رنگ یاد آتا ہے تمہارے انگ انگ سے نور یوں چھلک رہا ہے جیسے کانچ کی صراحی سے شراب کا رنگ چھلکتا ہے ۔

وہ نور کس چیز کا تھا ۔؟

"اس تصوّر کا کہ میں خوبصورت ہوں —"

جلیسہ ہنس کر بولی

"تمہاری وہ پرکشش ہنسی اب تک باقی ہے — جانے تم نے کس طرح اسے محفوظ رکھا ہے ۔ میرے لئے یہ ایک معمّہ ہے بہرحال تمہاری ہنسی آج بھی انگلینڈ کے اس موسم میں اٹلی کے آسمان کی یاد دلاتی ہے ۔!

"شکریہ !"

جلیسہ میرا ہاتھ ذرا سا دبا کر بولی — " اس عمر کو پہنچ کر ہر خوبصورت عورت ایک بھکارن بن جاتی ہے تعریف کے ایک ٹکڑے کیلئے ترستی ہے !

" مجھے یاد کر لینے دو ذہ جسم !

میں نے کہا ۔" فالسئی غرارے کے طلائی کام میں جھمجھماتا ہوا ریشمی جالی کے دھوپیں میں آگ کی طرح سلگتا ہوا ۔ لا دا بے چین بانہوں میں تھرکتا ہوا سینہ زورا ور پھٹ پڑنے کے لئے تیار . . . . . تمہارا حسن بڑا خطرناک تھا ۔ آج بھی یاد کرتا ہوں

لگتا ہوں کسی آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر کھڑا ہوں مگر جسم سے زیادہ تمہاری باتیں یاد ہیں۔ حسین عورت کی حماقت کی باتیں بھی الہام کا درجہ رکھتی ہیں۔ مگر جب واقعی ایک خوبصورت عورت ذہانت کی باتیں کرنے لگے۔ تو قیامت ہو جاتی ہے۔

"مزے کی بات یہ ہے کہ تم مجھے بالکل یاد نہیں ہو۔"

جیسبہ بولی

"اس وقت میں یاد رکھنے کے لائق نہ تھا ——" میں نے بتایا۔ عورت کی نوجوانی مرد کی نوجوانی سے مختلف ہوتی ہے عورت کی نوجوانی مکمل ہوتی ہے مرد کی ادھوری اور کچی —— اس پر آگہی کا عالم بہت دیر میں آتا ہے!

جیسبہ کچھ دیر سوچتی رہی —— پھر مسکرائی —— پھر ذرا رک کر ایک بار گی ہنس پڑی جیسے صاف، شفاف، اور چمکتے پانی کا فوارہ فضا میں بلند ہو گیا ہو۔ پھر یکایک ایسے چپ ہو گئی جیسے کسی نے فوارے پر پاؤں رکھ دیا ہو۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ بھی کچھ یاد کر رہی تھی۔

"میرا حسن میرے لئے ایک پرابلم رہا۔"

وہ سوچ سوچ کر بولی۔ "اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مجھے اپنے حسن سے نفرت رہی ہے۔ یوں تو ہوا ہی نہیں۔ کوئی مرد کسی عورت کی خوبصورتی سے اتنا پیار نہیں کرتا جتنا وہ خود کرتی ہے۔

مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی جیسا کہ تم کہتے ہو خوبصورتی کا ایک تاثر بھی ہوتا ہے۔ تو مرد ایسا کیوں کرتے ہیں؟ وہ اس تاثر کو خریدنے کی کوشش کیوں

کرتے ہیں ؛ اگر تمہارے اندر کوئی خوبصورتی نہیں ہے تو تم باہر کی خوبصورتی خرید کر بھی کیا کر لوگے ۔ خوبصورتی کو بار بار ہاتھ لگانے سے کیا وہ خوبصورتی تمہاری ہو جائے گی ۔ ؟

میں پوچھتی ہوں گلاب کے پھول کا مالک آج تک کون ہوا ہے ؛ میں یہ نہیں کہتی شادی کرنا بُرا ہے ۔ لیکن ملکیت کا یہ احساس یقیناً بُرا ہے اور پھر مردوں کا یہ دوغلا پن ـــــ شادی سے پہلے میری جان ـــــ میری ڈارلنگ کہتے کہتے منہ سوکھنے لگتا ہے ۔ ہاتھ جوڑتے ہیں ۔ ایک نگاہ کے لئے ترستے ہیں ، گڑگڑاتے ہیں ، پاؤں پڑتے ہیں اور پھر شادی کرنے ہی گھر کے آنگن میں لے جاکر تھان پر باندھ دیتے ہیں ایک گائے یا بھینس کی طرح جس کا دودھ دوہا جائے گا ۔ اور جس سے بچھڑا پیدا کیا جائے گا ۔

جمیلہ بولتے بولتے چپ ہو گئی اس کی آنکھیں دھواں دھواں ہو گئیں ۔

جمیلہ کی تلخی اس کی زندگی سے متعلق تھی جمیلہ کا پہلا شوہر سپریٹنڈنٹ پولیس تھا اس نے جمیلہ کو گھر میں حوالات کی طرح بند رکھنا چاہا ۔ جمیلہ اس کی خوبصورتی اور وجاہت محض اوپری تھی جمیلہ کا پہلا شوہر ایک بیل کی طرح وجیہہ تھا اور ایک سانڈ کی طرح مضبوط لیکن اس میں وہ نازکی احساس نہ تھی جس کے بغیر جمیلہ زندہ رہ سکتی تھی اس لئے وہ پہلے شوہر سے رسیاں تڑا کر بھاگی !

دوسری بار اس نے ایک آئی سی ایس سے شادی کی شادی سے پہلے کورٹ شپ کے زمانے میں مرد ایک دوسرا ہی آدمی ہوتا ہے ۔ انصاری کو معلوم ہو چکا تھا کہ جمیلہ حسین ہونے کے علاوہ ذہین بھی ہے خوش ذوق اور حساس بھی ہے ۔ لہٰذا اس نے اپنی کورٹ

شپ شیکسپیئر سے شروع کی۔ بیچ میں غالب آئے۔ براؤننگ آئے۔ ماتیس کی مصوری آئی چلئے شادی ہوگئی۔

جمیلہ بہت خوش تھی۔ ڈھنگ کا شوہر ملا۔

لیکن انصاری شادی کے بعد پھر آئی سی ایس بن گیا۔ جمیلہ سے ایسا سلوک کرنے لگا۔ جیسے وہ اس کی بیوی نہیں انڈر سیکرٹری ہو اس کی باتوں کی حلاوت بھی جاتی رہی ایسا چوبی لہجہ ہوگیا جیسے وہ اپنی بیوی سے بات نہ کر رہا ہو۔ کسی فائل پر دستخط کر رہا ہو۔

جمیلہ کو بہت مایوسی ہوئی اس نے انصاری سے بھی طلاق لے لی اس عرصہ میں اس کا بچہ سپرنٹنڈنٹ پولیس سے اور دو بچے آئی سی ایس سے ہو گئے تھے!

جمیلہ اب بھی بہت خوبصورت تھی۔ لوگ کہتے ہیں وہ اپنے وقت میں شمالی ہند کی سب سے حسین عورت تھی۔ لوگ کہتے ہیں ایسا حسن تو آج تک دیکھا ہی نہیں گیا اس لئے جمیلہ کو تیسرا شوہر چننے میں زیادہ دقت نہیں ہوتی اب کے اس نے ایک ادیب شوہر چنا۔

حساس طبیعت، شاعر مزاج، بات بات پر عورتوں کی طرح جھینپ جانے والا۔

جمیلہ کو یہ شوہر شروع شروع میں بہت پسند آیا۔ لیکن جلد ہی رنگ اترنے لگا۔ اس خوش ذوقی کی جلد کتنی باریک تھی اس کے اندر کتنی تجارت تھی۔ شہرت کی کتنی حرص تھی دوسرے ادیبوں کے لئے کتنی جلن تھی۔ پیسے کو ہر وقت گالیاں دینے کے باوجود ہر وقت پیسہ ہتھیانے کے لئے کتنی تگ و دو تھی ہر وقت سرمایہ داروں کو گالیاں دینے کے باوجود ان ہی کی جوتیاں چاٹنے کی کیسی خفیہ خواہش تھی

فراخدلی، انسانیت، خدمت، اور نیک دلی کا لبادہ اوڑھے ہوئے یہ ادیب اندر سے کتنا تنگ نظر اور خودغرض تھا جب اس کا اندازہ جمیلہ کو ہوئے ہوئے ہوتے لگا تو اس کی طبیعت بجھتی گئی۔

بجھتی گئی ـــــ اور جب ایک دن دھیرے سے اس کے شوہر نے جمیلہ کو مشورہ دیا کہ وہ فلم ایکٹریس بن جائے تو جمیلہ کو ایک دھکا سا لگا۔ اسے محسوس ہوا اگر وہ اس ادیب سے شادی کرنے کی بجائے جوہری بازار کے کسی جوہری سے شادی کر لیتی تو وہ اس ہیرے کی پرکھ زیادہ بہتر طریقے سے کرتا۔

جمیلہ اس ادیب سے بھی الگ ہو گئی۔ دھیرے دھیرے اب وہ اس نتیجے پر پہنچنے لگی کہ اس کے لئے شادی کرنا ہی غلط ہو گا۔ مگر اس کا حسن شعلہ ساماں اور آتش فشاں تھا۔ اسے دیکھتے ہی ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے انگارے کو چھو لیا ہو۔ گرم گرم لاوے پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔

جمیلہ واقعی اب عشق اور حسن، شاعری اور شادی سے اکتا چکی تھی۔ لیکن عاشق تھے کہ بولائے پھرتے تھے جدھر جاتی پریمی شہد کی مکھیوں کی طرح بھنبھنانے لگتے۔ جمیلہ کو ان کے عشق سے متلی ہونے لگی ان کی باتیں سن سن کر دل متلانے لگتا اب وہ کسی مرد کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ نہیں دے گی۔

جتنا اس کا انکار پختہ ہوتا گیا۔ مردوں کا اصرار بڑھتا گیا یوں تو عاشقوں کا ایک جم غفیر تھا۔ لیکن ان میں سے دو مرد بے حد قابل توجہ تھے۔ ایک تو انتہائی بے وقوف، سیدھا سادھا مگر بے حد امیر تھا۔ اس کے سارے چونچلے بچوں کے سے

تھے۔ اُسے دیکھ کر جمیلہ کے دل میں یہ خیال آنے لگا۔

کیوں نہ اب کے سے ایک ایسے مرد سے شادی کی جائے جس پر بیوی کی بجائے ماں کا ساحق جتایا جا سکے ــــ،

دوسرا مرد جنگلات کا ٹھیکہ دار تھا ــــ اَن پڑھ ــــ اور اپنے اَن پڑھ ہونے پر مغرور۔ کیونکہ اَن پڑھ ہونے کے باوجود وہ اپنی محنت سے لکھ پتی بن گیا تھا۔ اسے کتابوں سے نفرت تھی۔

کلچر اور شیکسپیئر، تھیٹر اور فن مصوّری اور شاعری، وہ ان سب سے نہ صرف یہ کہ نابلد تھا بلکہ نابلد رہنا بھی چاہتا تھا ــــ اس کی صحت بہت اچھی تھی اور اُسے شکار کا بہت شوق تھا اسے دیکھ کر جمیلہ کو خیال آیا کہ اتنی حسّاس ذہنی اور تمدّنی زندگی بسر کرنے کی بجائے کسی ایسے شوہر کے ساتھ جنگلوں میں زندگی بسر کرنا کتنا دلچسپ ہوگا۔

کبھی وہ بیوقوف امیر کی طرف جھکتی ــــ کبھی اس کا دل ٹھیکیدار کی طرف مائل ہو جاتا ــــ کبھی وہ دونوں سے دور رہنا چاہتی ــــ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی تھی دونوں کو چاہنے کا کوئی سوال نہ پیدا ہوتا تھا۔ صرف وہ یہ سوچ رہی تھی کہ ان دونوں میں سے کس کے ساتھ زندگی گزاری جائے۔ ۔ ۔ ۔ ۔!

جس بات کا فیصلہ جمیلہ نہ کر سکی اس کا فیصلہ ان دو نوں عاشقوں نے کر ڈالا ان کا قصّہ بہت مشہور ہے کس طرح لکھنؤ کے ایک باغ میں ان دونوں عاشقوں نے جمیلہ کی خاطر ڈوئیل لڑا؟

ڈوئیل کی رسم ہمارے ہاں کی رسم نہیں ہے۔ ہم عشق میں یا تو خود زہر کھا

لیتے ہیں یا لڑکی کو زبردستی بھگائے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں ڈوئیل نہیں ہوتا۔ لیکن جلیبہ کے لئے اپنے ہاں کی مقدس روایت بھی توڑ ڈالی گئی۔ اور ان دونوں عاشقوں نے لکھنؤ کے ایک باغ میں پستول لے کر ڈوئیل لڑا۔ اور نتیجے میں دونوں ہلاک ہو گئے اخباروں کے پہلے صفحہ پر جلی حروف میں اس ڈوئیل کی خبر اور جلیبہ کی تصویر شائع ہوئی اور اتنا ہنگامہ ہوا کہ بے چاری جلیبہ کو اپنا وطن چھوڑ کر لندن چلے جانا پڑا۔ اس کے ماں باپ بہت امیر تھے اس لئے اسے لندن میں روپے کی کبھی کوئی دقت نہ ہوئی پھر اس نے اپنے بچے بھی لندن بلا لئے۔ اور اس کے تینوں سابق شوہر اپنے بچوں کے لئے معقول وظیفے بھیجنے لگے۔ اس لئے جلیبہ کو بھی کسی طرح کی تکلیف نہ ہوئی ......!

"بچے کہاں ہیں؟"

"وہ تو پاکستان چلے گئے۔ دو ہندوستان میں ہیں۔ میں یہاں ہوں لندن میں"

اس کے بدن میں ایک جھرجھری سی آئی اور وہ چپ ہو گئی۔ باہر برف خاموشی سے گر رہی تھی۔ اندر آتش دان میں آگ جل رہی تھی۔ ایک لمبی آہنی سلاخ کو اپنے ہاتھ میں لے کر اس کے ہک میں ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا پھنسا کر وہ اسے آتش دان کی آگ پر گرم کرتی۔ پھر دوسرا ٹکڑا ـــــ اس طرح ہم دونوں باری باری اس آہنی سلاخ سے ٹوسٹ بناتے رہے۔ اور ہمبرگر بنا کر کھاتے رہے۔

ایرانی غالیچے پر رکھے ہوئے سنہرے جام، ہم دونوں آمنے سامنے فرش پر بیٹھے ہوئے اور دیواروں پر جلیبہ کی تصویریں انگلستان کے شاہی خاندان کے ساتھ....

بڑے بڑے آدمیوں کے ساتھ ـــــ وہ لوگ اپنے رُتبے کے اعتبار سے عظیم تھے، یا اپنے فن میں عظیم تھے۔ تو جیبہ اپنے حسن میں عظیم تھی۔

انگریز قوم کی وضعداری آج بھی باقی ہے۔!

جیبہ! میری نگاہیں شاہی خاندان کی ایک تصویر پر مرکوز دیکھ کر بولی

"شاہی خاندان والے خاص خاص موقعوں پر آج بھی جیبہ کو بلاتے ہیں اور اس کا شمار لندن کی حسین و جمیل عورتوں میں کرتے ہیں۔"

"اس میں کیا شک ہے ـــــ"

میں نے ذرا مبالغہ سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"میں نے پچپن برس کی ایسی عورت آج تک نہیں دیکھی ....."

"پچپن برس کی ـــــ!"

جیبہ نے کسی قدر اداسی اور تلخی سے کہا۔

"میں چپ ہو گیا۔

وہ بولی۔

"ایک عرصہ سے میں اپنی عمر کے خلاف لڑتی رہی۔ شامپو اور ہیر آئل کریم، روشنی بجلی، پانی بھاپ اور مالش۔ وہ سب کچھ جو اس لڑائی میں ضروری ہے میں نے کیا ـــــ اور میں کیوں نہ کرتی ـــــ جو شئے جس کے پاس ہوتی ہے وہ اسے سنبھال کر رکھنا چاہتا ہے میرے پاس میرا حُسن تھا۔ تو پھر میں اسے سنبھال کر رکھنے کی کوشش کیوں نہ کرتی ـــــ مگر یہ وقت کی چھلنی کیسی ظالم ہے۔ بوند بوند کر کے حُسن بہہ

جاتا ہے۔ آخر میں صرف چھلنی کے سوراخ رہ جاتے ہیں۔

"کیا تمہیں اپنے بچوں سے محبت نہیں ہوئی۔"

"ہوئی تو ——— بہت پیارے بچے تھے۔ جب تک میرے پاس رہے۔ اب بھی ان کے خط آتے ہیں اب اس عمر میں تجزیہ کرتی ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ مجھے اپنے حسن کے سوا کسی سے محبت نہیں رہی۔ کسی شوہر سے نہیں ——— کسی دوست سے نہیں ——— کسی بچے سے نہیں .... کسی سے بھی اتنی محبت نہیں رہی جتنی مجھے اپنے حسن سے رہی۔ میں کبھی ماں نہ بن سکی۔ جلیبہ ہی رہی۔!"

"شاید یہ اسی طرح کی محبت ہے جیسے کسی فنکار کو اپنے فن سے ہوتی ہے" میں نے کہا۔

"ہاں ——— مگر فرق ہے"

جلیبہ بولی

"فنکار کا فن اس کی زندگی کے ساتھ جاتا ہے۔ حسن راستے ہی میں ساتھ چھوڑ جاتا ہے ..... یہ اب معلوم ہوا ———!"

"اگر حسن سے تمہاری مراد جلد کی تازگی سے ہے، اگر حسن سے تمہاری مراد صرف آنکھوں کی چمک سے ہے، روح کی تازگی اور دل کی چمک سے نہیں ہے۔ تو تم سچ کہتی ہو۔ لیکن ایک حسن اندر کا بھی ہوتا ہے

اگر آدمی ——— عورت یا مرد وہ حسن اور توازن اپنے اندر پیدا کرے تو کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ میں نے بالشائے تھیٹر میں پچاس برس سے زیادہ عمر کی بوڑھی اُدلانوا کو سولہ برس کی "مینزل" کے کردار میں تتلی کی طرح ناچتے دیکھا ہے فنی توازن

نے وقت اور حسن دونوں کو منجمد کر دیا تھا...... !

"میں اولانو وا نہیں ہوں ——"

جبیبہ خفا ہو کر بولی

"میں جبیبہ ہوں —— میں اِسقدر چاہی گئی ہوں کہ کبھی اپنے ظاہری حسن کو نہیں بھول سکتی —— بھولنے کی کوشش بھی کی تو کسی نے بھلانے نہیں دیا...

"سنو جبیبہ ——"

میں نے اس کی تلخی کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"جس دن میں نے تمہیں پہلے پہل دیکھا تھا اسی دن تم سے عشق کرنے کا خیال آیا تھا۔ لیکن اس وقت میں بہت کم عمر تھا۔ اور اب..... !

"ہاں اور اب ؟"

اس نے تیکھی نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اب کیا ہے —— ؟

"اب بہت دیر ہو چکی ہے۔"

جبیبہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے اپنا جام اٹھا کر اتنے زور سے آتش دان میں پھینکا کہ میں اس کے چھناکے سے چونک پڑا۔

"کسی انگریز نے مجھ سے آج تک ایسی بیہودگی سے بات نہیں کی۔"

وہ غصے سے بولی۔

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"میں انگریز نہیں ہوں ——"

میں نے اس کے لئے دوسرا جام بناتے ہوئے کہا۔
"تم نے انگلستان میں رہ کر کسی انگریز سے شادی کیوں نہیں کی ——"
"کی تھی ——" وہ آنسو پونچھ کر بولی —— "وہ ایک انگریز سائنس دان تھا اور بہت شریف، معصوم اور بے ضرر آدمی تھا۔ مگر اس میں ایک ہی برائی تھی وہ میرے تلوے چاٹتا تھا!"
"تلوے ....."
"ہاں واقعی! دن میں دو ایک بار ضرور وہ میرے ننگے تلوؤں کو اپنی زبان سے چاٹتا تھا۔ اس میں اُسے لطف آتا تھا۔ لیکن مجھے بہت گھن آتی تھی ایسا لگتا تھا جیسے کوئی بھینس میرے قریب بیٹھی جگالی کر رہی ہو!"
وہ کہہ کر مسکرائی۔ مسکرا کر زور سے ہنسی —— اس کی ہنسی کا فوارہ کمرے میں فانوس کی طرح روشن ہوا اٹھا۔
"تین مہینے کے بعد میں نے اس سے طلاق لے لی"
"پھر کیا ہوا۔؟"
"پھر چند پھٹکل عاشق ——"
"اور اب ——" میں نے اس سے کہا
"اور اب ——" اس نے مجھ سے کہا —— "چلو دوسرے کمرے میں"

جب ہم دوسرے کمرے میں پہنچے تو وہ کمرہ فرش سے چھت تک تصویروں سے پٹا پڑا تھا۔ ایزل پر ایک ادھوری تصویر تھی رنگ اور برش بے ترتیبی کی حالت

میں پڑے تھے۔ اور دیواروں پر چھوٹے بڑے کینوس ٹنگے تھے۔
بڑی بھیانک تصویریں تھیں اور سب میں ایک ہی چہرہ تھا۔ اور ایک ہی جسم تھا ـــ جیبیہ کا اپنا ـــ کبھی وہ چیچک زدہ ـــ کبھی زخم خوردہ ـــ کبھی خون اور پیپ میں لتھڑا ہوا ـــ ایک آنکھ باہر نکل کر لٹکی ہوئی ـــ کبھی ناک طوطے کی طرح مڑی ہوئی ـــ کبھی چینیوں کی طرح پچکی ہوئی ـــ کبھی ہونٹ پھٹے ہوئے ـــ کبھی دانت غائب ـــ کبھی ہڈیوں کا پنجر ـــ کبھی سوکھی کھال میں ایک ایک پسلی نمایاں۔
مگر ان سب تصویروں میں جیبیہ کے سوا کوئی نہ تھا۔
"مجھے قادر یار نے بتایا تھا ـــ" میں نے جیبیہ سے کہا۔ "کہ تم تصویریں بناتی ہو مگر کسی کو دکھاتی نہیں ہو۔"
"میں تمہیں یہاں تصویریں دکھانے کے لئے نہیں لائی تھی ـــ اپنے شوہر سے ملانے کے لئے لائی تھی ـــ"
"تمہارا شوہر......"
میں نے حیرت سے کہا۔
"ہاں ـــ" وہ بولی "آؤ تمہیں ملا دوں اپنے نئے شوہر سے"
اتنا کہہ کر وہ مجھے تصویروں سے بھرے ہوئے ایک کونے میں لے گئی یکایک میں ڈر کے مارے پیچھے ہٹ گیا......!
میرے سامنے ایک بہت بڑا پائی تھان پڑا تھا۔ بہت موٹا اور کئی فٹ لمبا اجگر کنڈلی مارے ایک کونے میں نیم مدہوش پڑا تھا۔

اس رات حبیبہ نے ہمیں سوہو کے ایک نائٹ کلب میں سپر پر مدعو کیا تھا ـــــ مجھے اور میرے دوستوں کو ـــــ میں نے قادر یار، من موہن اور اس کی بدصورت یونانی لڑکی کو مدعو کر لیا تھا۔

قادر یار اور من موہن یہ دیکھ کر بہت حیران ہوئے کہ حبیبہ جیسی عورت سے میری شناسائی ہے جو ایک امیر کبیر عورت ہے جس کا شمار دس پندرہ برس تک لندن کی حسین ترین عورتوں میں ہوتا رہا ہے جو کئی بار شاہی خاندان کی مہمان رہ چکی ہے۔ اس حبیبہ نے آج ہمیں سپر پر بلایا ہے۔

"جی ہاں ـــــ"

میں نے ایسی سادگی سے کہا جس پر فخر کا شک بھی ہو سکتا تھا۔

ہم لوگ وقت پر پہنچ گئے تھے۔ مگر حبیبہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ ہمارا ٹیبل ایک خوبصورت کونے میں سجا ہوا تھا جہاں ویٹر نے ہمیں لے جا کر بٹھا دیا تھا۔ میں نے پائی تھان والا قصہ اپنے یاروں کو سنایا

قادر یار تو گہری سوچ میں پڑ گیا مگر من موہن کو ذرا حیرت نہ ہوئی

"اس میں تعجب کی بات کیا ہے ـــــ"

من موہن اپنی بدصورت محبوبہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولا

"ہر انسان کی زندگی میں ایک وقت آتا ہے جب وہ ایک بھلائی تھان پال لیتا ہے یا کوئی بدصورت لڑکی یا کوئی بدصورت جذبہ پال لیتا ہے۔ اپنے ماحول سے بیزاری کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ آدمی جس کے ساتھ رہنے پر مجبور ہو جائے اس کا منہ چڑاتا ہے۔ جیسے میں اس لڑکی کا منہ چڑاتا ہوں۔ بیزاری اور نفرت

بھی ایک طرح کا پاگل پن ہے یعنی ہر نفرت کی دُم لمبی ہوتی ہے اور اس میں زہر بھی ہوتا ہے!"

قادر یار بولا۔

"اب میں یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ فزکس کا قانون کہ ہر عمل کا ردِ عمل بھی ہوتا ہے اور بڑی شدّت سے ہوتا ہے صرف فزکس کی دنیا پر ہی نہیں نفسیات کی دنیا پر بھی لاگو ہوتا ہے جب انسان اپنے ماحول اپنی زندگی اور اس کی ترتیب سے مایوس ہو جائے تو باطنی توازن بگڑ جاتا ہے۔ پھر اس توازن کو سنبھالنے کے لئے اس ذہنی گھٹن کو راستہ دینے کے لئے انسان کیا کیا جتن کرتا ہے۔ وہ ایک پاگل پن پال لیتا ہے۔ کوکین کھاتا ہے۔ بھیانک مصوّری کرتا ہے۔ چرس کا دم لگاتا ہے، ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھتا ہے پلیٹ فارم پر چڑھتا ہے اور دس ہزار آدمیوں کے سامنے دو گھنٹے بکواس کرتا ہے یا بور پر بور افسانے لکھے چلا جاتا ہے یا ہر روز کسی نئی لڑکی سے عشق کرتا ہے اور اگر یہ سب کچھ اسے نصیب نہیں ہوتا تو گھر آکر اپنی بیوی کو گالی دیتا ہے اور اپنے بچّوں کو پیٹنے میں مصروف ہو جاتا ہے!"

"تم نے جتنی باتیں کیں ——— "

میں نے قادر یار سے کہا ——— اس میں سے صرف ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھنے والی بات مجھے پسند آئی۔ یعنی گھٹن کے اظہار کے بھی کئی طریقے ہیں اپنے ماحول سے بیزاری کا اظہار کسی کو گالی دینے میں کیوں ہو۔ ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھنے کی کاوش میں کیوں نہ ظاہر ہو۔

"تم تو ہر بات میں مقدّسیت گھسیٹ لاتے ہو۔" من موہن خفا ہو کر بولا

پھر رُخ بدل کر اپنی محبوبہ سے پوچھنے لگا۔
"پائی تھان کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے"
"کھا جائے گا ——" یونانی لڑکی بولی
ہم سب ہنسنے لگے —— وہ بھی ہنسی —— اُف، کتنی بھیانک ہنسی تھی۔ کیسے میلے اور پیلے پیلے دانت تھے۔ پھر بولی
"لیکن یہ ایک سے اچھا ہے دوسرے لوگ ٹکڑے ٹکڑے کرکے مہینوں اور سالوں میں اپنی بیوی کو کھاتے ہیں۔ یہ پائی تھان ایک ہی جھٹکے میں حبیبہ کو نگل جائے گا۔ ایک بار مرنا اچھا ہے ہزار بار مرنے سے....."
کیسی خوفناک شدت تھی اس لڑکی کی باتوں میں۔ اس کے چہرے کا رنگ ہی بدل گیا۔ اب وہ مجھے کچھ کچھ خوبصورت معلوم ہونے لگی کیونکہ ذہانت بھی چہرے کو بدل دیتی ہے پھر بدصورتی نکل جاتی ہے۔ جھُریاں اور شکنیں غائب ہو جاتی ہیں غم کم ہو جاتی ہے۔ صرف ایک روشن خیال کا روشن تاثر چہرے پر دمکتا رہ جاتا ہے حبیبہ نے یہی غلطی کی۔ اس نے اپنے حُسن کا اہتمام کیا۔ زندگی بھر اپنے گالوں کے گلاب کھلاتی رہی اور بھُول گئی ان گلابوں کو جو دل کی ٹہنی پر اگتے ہیں جو ایک معمولی نارمل عورت کی آرزو ہیں مامتا، رفاقت، سپردگی، ایثار، کسی میں خود کو کھو دینے کی تمنا، کسی کو اپنا سب کچھ دے دینے کی آرزو..... حبیبہ بھُول گئی کہ عارض کے گلاب مرجھا جاتے ہیں —— لیکن آرزو کے گلاب ہمیشہ زندہ رہتے ہیں ——!

یکایک نائٹ کلب کا دروازہ کھُلا۔ اور ہم سب اُدھر دیکھنے لگے۔
حبیبہ نائٹ کلب کے دروازے پر کھڑی تھی۔ آنکھیں گہرے کاجل سے سنوری ہوئی، چہرہ میک اپ سے درخشاں، گلے میں ہیرے کا گلوبند جھم جھماتا ہوا۔ اُس نے اپنا ہاتھ ایک ایسے انگریز کے ہاتھ میں دے رکھا تھا۔ جس کی عمر مشکل سے بائیس برس کی ہوگی۔

آدم خور

پھوٹو دھن نے ممتاز کی لاش کو گھسیٹ کر زادر اور پریل کے ایک درمیانی چوک کے ایک بڑے مین ہول کے کنارے رکھا۔ جو کالٹیکس پٹرول پمپ کے سامنے سڑک میں تھا اور پھر اسے بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ جب وہ ممتاز کی لاش کو گھسیٹ کر مین ہول کے پاس لارہا تھا تو اکا دکّا راہگیر جو ابھی تک سڑک پر چل رہے تھے خوفزدہ ہوکر اِدھر اُدھر کی گلیوں میں بھاگ گئے۔

نکڑّ کے ایرانی نے اندر سے اپنی دکان بند کرلی، پھول والے، پان والے اور تنبولی اپنی دکانیں کھلی چھوڑ کر بھاگ گئے تھوڑی دیر میں سڑک پر سنّاٹا ہو گیا۔ سامنے میونسپلٹی کے بھنگیوں کی کھولیاں تھیں جن کے باہر ننگ دھڑنگ بچے اکثر کھیلا کرتے تھے۔ مگر اس وقت ان کی معصوم آواز بھی سنائی نہ دیتی تھی چاروں طرف مکمل خاموشی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس اس علاقے کی روح اپنے

منہ پر ہاتھ رکھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ڈری ہوئی، سہمی ہوئی، مین ہول کے کنارے چپ چاپ کھڑی ہے۔

پٹور دھن نے ممتاز کے سیاہ گھنگھریالے بال زور سے پکڑے اور ایک جھٹکے سے اس کے چہرے کو اپنے سامنے لایا۔۔۔ ممتاز کے چہرے پر کسی کرب کا نشان نہ تھا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ گہری نیند سو رہا ہے۔ اس کا گورا چہرہ خوبصورت نہ تھا۔ مگر مضبوط ضرور تھا۔ اس کے چہرے سے مضبوطی کے ساتھ ایک قسم کی ہیکڑی اور رعب کا انداز مترشح تھا۔

پٹور دھن کو اس کے چہرے پر موت کے بعد بھی استہزا کا شائبہ سا نظر آیا اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ممتاز مرنے کے بعد اس کا منہ چڑا رہا ہو اس نے ممتاز کے بالوں کو جھٹکے دے دے کر اس کے چہرے کو سڑک کے سخت فرش پر پٹکا جب اس سے بھی اس کی تسلی نہ ہوئی تو وہ کالٹیکس کے پیٹرول پمپ کے اندر چلا گیا اور خوفزدہ بنئے سے ایک جیک مانگ لایا اس نے دو تین بار لوہے کے جیک کو ممتاز کے چہرے پر اس زور سے مارا کہ ممتاز کے جبڑے ٹوٹ گئے اور اس کے دانت باہر نکل آئے۔ اور پٹور دھن کو معلوم ہوا جیسے ممتاز ابھی تک اس پر ہنس رہا ہے۔ قہقہے لگا رہا ہے۔

اس نے تین چار بار جیک کو اس کے سر پر مارا اور پھر لاش کے ٹکڑے کرنے کے لئے اپنے تیز ٹکوے کو اٹھایا۔

ممتاز اور پٹور دھن دونوں دادر مین روڈ کے غنڈے تھے۔ لیکن جب تک ممتاز زندہ رہا۔ پٹور دھن کو نمبر دو سوالی ہی سمجھا جاتا رہا۔ سیٹھ سورج مل

جس کی دادر مین روڈ اور اس کے آس پاس کی گلیوں میں بہت سی بلڈنگیں تھیں اور سیٹھ ترویدی لال جس کے دادر میں تین فلم اسٹوڈیوز تھے دونوں ممتاز کی زیادہ عزت کرتے تھے۔

سیٹھ ترویدی لال نے اپنی تمام فلموں میں اکسٹرا بھرتی کرنے کا ٹھیکہ ممتاز کو دے رکھا تھا۔ صرف چند چھوٹی چھوٹی فلم کمپنیوں والے ہی بڑی مشکل سے پٹور دھن کو کام دیتے تھے۔ دادر بازار کی مسجد سے لے کے پریل کے ناکے تک ممتاز کا راج تھا اور مسجد سے ادھر دادر جی پی آئی اسٹیشن تک اور ادھر چھوٹے بازار میں جو رستہ گھوم کر خدا داد سرکل کی طرف جا نکلتا تھا۔ ادھر پٹور دھن کا راج تھا مگر دونوں غنڈے اکثر ایک دوسرے کے علاقے میں چھاپہ مارا کرتے تھے۔ پٹور دھن کم مگر ممتاز زیادہ دلیری اور جی داری سے چھاپے مارتا تھا۔ اور کبھی کبھی تو علی اعلان پٹور دھن کے علاقے میں گھس کر اس کے غنڈوں کو پیٹ دیا کرتا تھا۔ ممتاز کا قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا، کسرتی گورا بدن، جہلم کا رہنے والا بڑا ہتھ چھٹ اور گالیاں بکنے والا تھا۔ اس کے خلاف پٹور دھن بڑا متین اور گھنا تھا۔ اس کا قد ناٹا اور رنگ سیاہ تھا لیکن آنکھیں نیلی تھیں۔ اس کے سیاہ چہرے پر نیلی آنکھیں اس کے چہرے کو عجیب وحشتناک سا بنا دیتی تھیں اور جب وہ اپنی وحشتناک نیلی نیلی آنکھوں سے کسی کی طرف گھور کر دیکھتا اور دبی زبان میں اسے دھمکی دیتا تو اس کی دھمکی کا پرامن شہریوں پر فوری اثر ہوتا تھا مگر ممتاز کے سامنے اس کی ایک کور ہمیشہ دبتی تھی۔ کئی بار ممتاز اور پٹور دھن کے غنڈوں میں لڑائی ہوئی کئی غنڈے مارے بھی گئے۔ جیل بھی گئے لیکن ممتاز اور پٹور دھن کی دو بدو لڑائی اب تک

نہ ہوئی تھی۔ کئی بار غصے میں آ کے ممتاز نے پٹور دھن کو للکارا بھی تھا بلکہ ایک بار سرِ بازار اسے گردن سے پکڑ کر اس کے بازوؤں کو یوں مروڑ دیا تھا۔ کہ پٹور دھن کا تیز لپلپاتا ہوا چاقو جو شائد دوسرے لمحے میں ہی ممتاز کی آنتیں چیر دیتا۔ زمین پر گر پڑا تھا۔ اور پٹور دھن بالکل نہتا ہو کر بے بس اور مجبور ہو کر ممتاز کے ہاتھوں میں بید لرزاں کی طرح کانپ رہا تھا۔

اس لمحے کی رسوائی کا خیال آتے ہی اب گویا پٹور دھن پر تیز بخار کی ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی اس نے اپنے ٹکوے کو اوپر ہوا میں اٹھایا اور اس کے پے در پے وار کر کے اس نے لاش کو دھڑ سے کاٹ دیا اور دھڑ کا نیچے کا حصہ مین ہول میں گرا دیا۔

اس وقت دور آسمان پر ایک چیل بڑی بے صبری سے چلّائی بجلی کے تاروں سے الجھتی ہوئی ایک خالی ٹرام نالے پر سے گزر گئی۔ پھر چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔

پٹور دھن کی نظر ممتاز کے دائیں ہاتھ پر پڑی اس ہاتھ پر انگریزی میں ایک نام کھدا ہوا تھا۔ "مایا"۔

"مایا" ایکسٹرا لڑکیوں میں حسین ترین مانی جاتی تھی اسے رقص کا بہت شوق تھا وہ اکثر سبز ساڑھی میں ملبوس نظر آتی تھی اس لئے لوگ اکثر اسے مورنی کہتے تھے پٹور دھن کو اس کی ہنسی بہت پسند تھی۔ اور اس کی ٹھوڑی کے نیچے میں ایک سبز بندیا کھدی ہوئی تھی اور جب وہ ہنستی تھی تو سبز بندی کے پاس ایک عجیب سا خم پڑتا تھا جسے دیکھ کر پٹور دھن پاگل ہو جاتا تھا ۔۔۔ مایا تو گاؤں سے آئی تھی اس لئے فلم

میں کام کرنے کے باوجود ابھی تک اس کی شخصیت میں گاؤں کی لڑکی کا سا الھڑپن تھا اور اس کی بیباکی اور صاف گوئی کی جھلک تھی گو وہ پٹور دھن کے لوٹے میں ہی تھی۔ مرہٹی لڑکی ہونے کی وجہ سے اس کا سب سے پہلے پٹور دھن کے لوٹے میں آنا کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی لیکن سب سے اچنبھے کی بات یہ تھی۔ لیکن سب سے اچنبھے کی بات یہ ہے کہ ہزار کوشش کے باوجود وہ اب تک اس کے ہتھے نہیں چڑھی تھی۔

پٹور دھن نے مایا کو اپنے قابو میں لانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی کسی غنڈے کے لئے اس سے بڑی بے عزتی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ کسی عورت کے لئے چند مہینوں یا چند دنوں کے لئے شریف بن جائے۔ مگر پٹور دھن نے مایا کو حاصل کرنے کے لئے یہ بے عزتی بھی گوارا کی تھی اسے آفتاب محل اسٹوڈیوز کے پچھواڑے کی گلی میں ایک صاف ستھری کھولی رہنے کو دی تھی ـــــ فرنیچر مہیا کیا تھا جب فلم کمپنی سے پیسے وصول ہوتے تو وہ پیسے لے کر سب سے پہلے مایا کے گھر جاتا۔ مایا پیسے لے کر شریر نگاہوں سے اس کی طرف تاکتی ـــــ مورنی کی طرح رقص کا ایک چکر اس کے گرد کاٹتی اس کے شانوں کو اپنی حسآس انگلیوں سے چھو لیتی یوں کہ پٹور دھن کی آنکھوں میں نشہ سا اترنے لگتا اور وہ چپ چاپ مجبور ہو کر کھولی سے باہر نکل آتا۔

آج تک کسی عورت نے اسے مات نہ دی تھی ـــــ یہ نہیں کہ اسے مایا سے محبت تھی۔ پٹور دھن کو جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا آج تک کسی سے محبت نہیں ہوئی تھی ـــــ مایا سے بھی محبت نہیں تھی ـــــ بس وہ اسے جیتنا

چاہتا تھا۔ جیسے آدمی شطرنج کی ایک بازی جیتتا ہے۔ پاریس میں گھوڑی جیتتی ہے اور وہ اپنی فکر و عمل کا سارا زور اسے جیتنے میں صرف کر دیتا ہے یہی پٹوردھن کی حالت تھی۔

اس لئے اس روز اسے بہت غصہ آیا جب اس نے دیکھا کہ علی بخش گوند نے والے کی دوکان پر ممتاز کھڑا ہوا اپنی بانہہ پر "مایا" کا نام کھدوا رہا ہے اور مایا کے نام کے اوپر اپنا نام بھی ممتاز گدوا رہا ہے۔

ایک چیخ مار کر اس نے ممتاز پر اپنے چاقو سے حملہ کرنا چاہا مگر ممتاز کے غنڈوں نے جو سائے کی طرح اپنے مالک کے ساتھ لگے ہوئے تھے اسے راستے ہی میں دبوچ لیا۔ پھر دونوں طرف کے غنڈوں میں وہ لڑائی ہوئی، وہ لڑائی ہوئی کہ سوڈا واٹر بیچنے والوں کی بوتلیں پھوٹ گئیں اور آم بیچنے والوں کے آم سڑک پر لڑھک گئے۔ اور پرانے جوتے بیچنے والی، غریب عورتوں کے جوتے بازار کی موریوں میں بہہ گئے۔

تھوڑی دیر کے بعد پولیس آگئی اور چند غنڈوں کو گرفتار کر کے لے گئی۔ ممتاز مسکراتا ہوا علی بخش کی دوکان پر اپنی بانہہ گدواتا رہا۔

اسی رات ممتاز مورفی کو اس کی کھولی سے اٹھا لے گیا مایا بہت چیخی، چلائی مگر بلڈنگ والے سب ممتاز کو جانتے تھے کہ وہ کیسا خونناک آدمی ہے۔ اس لئے سب چپ رہے۔ ممتاز اپنے طاقت ور بازوؤں میں مایا کو اٹھا کر لے گیا سب کے سامنے۔ اور کسی میں ہمت نہ ہوئی کہ اس کے راستے میں آئے۔ اور جب پٹوردھن کو خبر ملی اس وقت تک ممتاز مایا کو لے کر اپنے علاقے میں پہنچ چکا تھا۔ جہاں

ممتاز نے مایا کو سیٹھ سورج کی بلڈنگ نمبر سات میں رکھ دیا جہاں اس نے پہلے ہی سے اپنے بہت سے موالی بھر رکھے تھے۔

پٹور دھن دانت پیس کے رہ گیا مگر اس نے آس نہیں چھوڑی اس نے علاقے میں ہندو مسلم سوال کھڑا کرنا چاہا۔ مگر علاقے کے بڑے بڑے سیٹھ سب ممتاز کے حامی تھے اس لئے کسی نے اس سوال کو ہندو مسلم سوال نہیں بننے دیا ممتاز سیٹھوں کی بلڈنگوں کا کرایہ بڑی خوش اسلوبی سے وصول کرتا تھا فلم اکٹرا لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ کے رکھتا تھا۔ اُن سے کم سے کم بھاؤ میں کام کروائے سیٹھ کو خوش رکھتا تھا۔

اس کے علاوہ موقعہ بے موقعہ ضرورت پڑنے پر سود خور پٹھانوں سے فلم کمپنیوں کو قرضہ دلوا دیتا تھا۔ سیٹھ لوگ ایسے کار آمد شخص کو جیل بھیجنے کے لئے قطعی تیار نہ تھے۔ اس لئے پٹور دھن اور اس کے حواریوں اور چند ہندو مہاسبھائی دوکانداروں کے باوجود مایا کا اغواء ہندو مسلم سوال نہ بن سکا۔

دادر کی مسجد میں چند روز نمازی بڑی مسرت سے اس کارِ خیر کا ذکر کرتے رہے مگر یہ کوئی ایسی سنسنی تو نہ تھی جو ان میں بانٹی گئی ہو اس لئے چند دنوں کی مسرت سرد مہری میں تبدیل ہو گئی۔ تھوڑے دن اور گزرنے کے بعد لوگ اس واقعہ کو بھول گئے۔

لیکن پٹور دھن نہیں بھولا ـــــ ایک رات اس نے بھی بلڈنگ نمبر سات پر جوابی حملہ کر دیا ـــــ حملہ غیر متوقع اور اچانک تھا۔ پٹور دھن اپنے حواریوں کو لے کر بلڈنگ کے اندر گھس آیا اور دراتے ہوئے سیدھا مایا کی کھولی کے اندر

آگیا۔ اس وقت ممتاز اپنی بنیان اتارے ایک ریشمی لاچا پہنے کھٹیا پر بیٹھا تھا اور مایا اس کے پاؤں دبا رہی تھی۔

مایا کو ممتاز کے پاؤں دباتے دیکھ کر پٹو ردھن کی آنکھوں میں خون اتر آیا لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھال کر کہا۔

"ممتاز! تیری بلڈنگ کا میرے آدمیوں نے ناکہ بند کر دیا ہے۔ تیرے پاس دس آدمی ہوں گے تو میرے پاس پچاس ہیں۔"

"پھر ——؟"

ممتاز نے وہیں کھٹیا پر بیٹھے بیٹھے بڑی نخوت سے کہا

"آج میں مایا کو لینے آیا ہوں —— اور اسے لے کر ہی جاؤں گا۔"

"لے جا اگر یہ تیرے ساتھ جاتی ہے ——"

ممتاز نے بڑی نرمی سے کہا —— "مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں عورتوں کے لئے نہیں لڑتا۔"

ممتاز نے اتنا کہہ کے اپنے ہاتھ اپنے سینے پر باندھ لئے۔

پٹو ردھن حیران ہو گیا، بولا

"تجھے کوئی اعتراض نہیں ہے"

"خدا رسول کی قسم مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے"

"تو چل مایا ——"

پٹو ردھن نے مایا سے کہا۔

مایا چپ چاپ بیٹھی ممتاز کے پاؤں دباتی رہی۔

"کیا تو مسلمان ہو گئی ہے۔"

پٹور دھن نے بڑے غصے سے پوچھا

"نہیں، میں ہندو ہوں۔"

مایا نے جواب دیا

"پھر اٹھ، کیا سوچ رہی ہے میں تجھے آزاد کرانے آیا ہوں"

مایا چپ بیٹھی ممتاز کے پاؤں دباتی رہی

"تو جانتی ہے تو کس سے محبت کر رہی ہے۔"

"ایک مسلمان سے۔"

مایا نے جواب دیا

پٹور دھن نے بڑے کڑوے لہجے میں کہا۔

"اس نے سات عورتیں رکھی ہوئی ہیں، بملا، کملا، روپا، رضیہ کنول سلمے گوپی، میں سب کو جانتا ہوں چاہے تو میرے ساتھ چل، ایک ایک سے پیچھا چھڑائے دیتا ہوں۔ ایسے بدمعاش آدمی کے ساتھ تو رہے گی تو تیری زندگی برباد ہو جائے گی۔ میں تجھے عزت دیتا ہوں، گھر دیتا ہوں —— شادی کر کے رکھتا ہوں مایا بول —— مایا بول —— تیرا کیا جواب ہے۔"

مایا آہستہ سے زمین سے اٹھی دبے پاؤں سر جھکائے پٹور دھن کے سامنے آگئی سامنے جا کے اس نے آہستہ سے اپنی نظریں اوپر اٹھائیں اور پٹور دھن کی طرف دیکھ کے اس کے چہرے پر تھوک دیا۔

پٹور دھن نے اپنا خنجر نکالا۔ ممتاز بجلی کی طرح لپک کر بیچ میں آگیا

پھر بھی خنجر کا پھل ممتاز کے شانے میں گھس گیا۔ اس نے آہستہ سے خنجر اپنے شانے سے نکالا دانت پیس کے بولا۔

"خدا اور رسول کی قسم کھا چکا ہوں اس لئے مایا کے لئے تم سے نہیں لڑوں گا۔ اب خیریت اسی میں ہے کہ بلڈنگ سے نیچے اتر جاؤ۔"

پٹوردھن جانا نہیں چاہتا تھا مگر اس نے کنکھیوں سے نیچے سیٹھ سورج مل کو پولیس کے ساتھ آتے دیکھ لیا تھا اس لئے اس نے اس وقت بھاگ جانے میں ہی بہتری سمجھی۔

اسی لئے اس وقت مایا کا نام ممتاز کی بانہہ پر گدا دیکھ کر پٹوردھن کا خون کھولنے لگا۔ اس نے ٹکوے سے اس بانہہ کو جسم سے الگ کیا بانہہ میں سے اس گوشت کے حصے کو الگ کیا جہاں ممتاز اور مایا کا نام تھا پھر ٹکوے مار مار کے اس نے گوشت کے اس ٹکڑے کو قیمے کی طرح ریزہ ریزہ کر دیا۔ اور اسے مین ہول میں پھینک دیا۔ یکایک اس نے ممتاز کو پھر پکڑ لیا اور ایک وحشیانہ خوشی سے چلا کر بولا

"اب بول حرام زادے — اب بول"

ممتاز کا خاموش سُتا ہوا چہرہ دیکھ کر اسے رات کا واقعہ یاد آ گیا — ملک تقسیم ہو چکا تھا۔ شہر میں ہندو مسلم فساد ہو رہے تھے۔ بمبئی میں باہر سے ہزاروں لاکھوں سندھی مہاجر آ رہے تھے۔ مسلمان علاقوں سے ہندو بھاگ رہے تھے اور ہندو علاقوں سے مسلمان،

دادر اور پریل کا علاقہ گو ہندوؤں کا تھا لیکن ممتاز ابھی تک وہاں

جما ہوا تھا۔ اس کے بہت سے ساتھی بھاگ گئے تھے۔ سود خور پٹھان سب رخصت ہو چکے تھے لیکن ابھی تک مسلمانوں کی ایک کثیر آبادی ممتاز کے بل بوتے پر سیٹھ سورج مل، ترویدی لال اور گوردھن داس کی بلڈنگوں اور ان کی کھولیوں میں رہ رہی تھی۔ ان میں سب ہی لوگ غنڈے نہیں تھے بہت سے شریف آدمی تھے۔ محنتی مزدور تھے، صناع تھے، کلرک تھے۔ چھوٹے چھوٹے دوکاندار اور مکینک تھے اور ڈرائیور اور کلینر تھے۔ گلی گلی سودا بیچنے والے تھے۔ فلم ایکسٹرا تھے، ادیب تھے، بے کار تھے، ہر طرح کے لوگ شامل تھے اور یہ سب لوگ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ممتاز غنڈہ ہے۔ کئی خون کر چکا ہے: کئی عورتیں اغوا کر چکا ہے۔

پھر بھی اس پر بھروسہ کر رہے تھے۔ ایک عجیب بے بس مجبور معصوم سا بھروسہ جسے دیکھ دیکھ کر ممتاز کو ان لوگوں پر رحم آنے لگا۔ اس کے دل کے اندر نامعلوم کوئی عجیب سی چیز جاگنے لگی ایسی چیز جو شائد اس نے کبھی اپنی ماں کی گود میں محسوس کی تھی، اپنی خالہ کی ننھی لڑکی کے ساتھ کھیلتے ہوئے محسوس کی تھی۔ جہلم کے کنارے ریت کے گھروندے بناتے ہوئے محسوس کی تھی۔ وہ نامعلوم سی — بات نہ آنے والی — ہاتھ لگاتے ہی لاجونتی کی طرح ایک کونے میں دبک جانے والی شرمیلی نرم کونپل کی طرح اس کے دل میں پھوٹنے لگی — اور وہ خود حیران ہو گیا — کہ ان لوگوں کا حیرت ناک بھروسہ اسے کہاں سے کہاں لے جا رہا ہے اس وقت علاقے کے جتنے غنڈے تھے سب ہندو مسلم فساد میں لگے ہوئے تھے اور دونوں ہاتھوں

سے اپنے ہاتھ رنگ رہے تھے۔ خون سے بھی اور پیسے سے بھی،

لیکن وہ دن بدن فساد سے دور ہٹتا چلا گیا اپنے علاقوں میں اس نے فساد کرانے والوں کو روک دیا اب وہ دن اور رات گشت کرتا تھا اور اپنے علاقے کے ہندو اور مسلمان دونوں کو لڑائی جھگڑے سے باز رہنے کی تلقین کرتا تھا۔ بہت سے مسلمان غنڈوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور بھنڈی بازار چلے گئے۔ بہت سے ہندو غنڈوں نے اس پر بزدلی کا الزام لگایا۔ مگر ممتاز بدستور اپنے علاقے کی نگہداشت میں مصروف رہا اور وہ ہر روز سیٹھ سورج مل، ترویدی لال اور گوردھن داس کے گھر حاضری دیتا اور ان سے اپنے کارنامے بڑے فخریہ لہجے میں بیان کرتا کہ آج کس طرح اس نے اپنے علاقے میں ہندو مسلم فساد روک دیا۔ اور کل فلاں جگہ پر کس طرح عین موقع پر پہنچ کر اس نے حالات پر قابو پالیا۔

سیٹھ لوگ خوش ہو کے اس کی تعریف کرتے اور اسے روپیہ پیسہ بھی دیتے اور ہر طرح سے اس کی عزت کرتے اور ممتاز یوں خوش ہو کے پلٹتا جیسے وہ واقعی کارِ نمایاں سرانجام دے کے واپس آرہا ہو۔

لیکن اصل بات یہ تھی کہ سیٹھ اب اس سے خوش نہیں تھے اس لئے نہیں کہ ممتاز مسلمان تھا اول تو روپے کا کوئی مذہب نہیں ہوتا کوئی رنگ اور مزاج نہیں ہوتا اس کی کوئی قوم نہیں ہوتی اور کوئی ملک نہیں ہوتا۔ اس کی کوئی حمیت نہیں ہوتی اور کوئی محبت نہیں ہوتی روپے کی ابتداء اور انتہا روپیہ ہے اور زیادہ روپیہ ہے اس لئے تو اب سیٹھ گوردھن داس، سورج مل اور

ترویدی لال ممتاز سے در پردہ خفا ہو گئے تھے۔ کیونکہ وہ اپنے علاقے سے مسلمانوں کا اخراج چاہتے تھے۔ اس لئے نہیں کہ ـــــ انہیں مسلمانوں سے کوئی خاص بیر تھا یہ مسلمان لوگ تو برسوں سے ان کی بلڈنگوں چالیوں اور کھولیوں میں رہتے آرہے تھے۔ اور برسوں سے ممتاز ان سے بڑی خوش اسلوبی سے کرایہ وصول کرتا آرہا تھا۔

لیکن اب یہ مصیبت آپڑی تھی کہ سندھی مہاجر، سینکڑوں ہزاروں لاکھوں مہاجر اپنی دولتوں کو سمیٹے بمبئی آرہے تھے۔ اور ان لوگوں کو مکانوں کی ضرورت تھی اور وہ لوگ امیر بھی تھے۔

مکان کے لئے پگڑی بھی دینے کے لئے تیار تھے اور بلیک میں زیادہ سے زیادہ کرایہ بھی مل رہا تھا۔ مکانوں کی پگڑیاں ہر روز بڑھتی جارہی تھیں بلیک میں ایک کمرے کے دام ڈھائی سو سے ڈھائی ہزار تک ہو گئے تھے اور یہ ادھر بیوقوف ممتاز تھا کہ اپنے علاقے میں ہندو مسلم فساد ہی نہیں ہونے دیتا تھا۔ اب فساد نہیں ہوگا۔ تو مسلمان ڈر کے بھاگیں گے کیسے ـــ کمرے کیسے خالی ہوں گے۔ پگڑیاں کیسے ملیں گی ـــ تجوریاں کیسے بھریں گی؟

یہی سوچ سوچ کر آخر ایک دن سیٹھ سورج مل اور گوردھن داس نے ایک خفیہ میٹنگ کی اور سب کچھ طے کرنے کے بعد پٹور دھن کو بلایا گیا۔

پٹور دھن نے ٹکوے کے ایک آخری وار سے ممتاز کا سر گردن سے جدا کر دیا پہلے تو اس نے گردن کے نیچے کا حصہ مین ہول میں پھینک دیا پھر اس نے ممتاز کے سر کو بالوں سے پکڑ کے ناریل کے پھل کی طرح ادھر ادھر جھلایا

لیکن جب اسے سڑک پر آ رہا یہ حدِ نظر تک اس کی فتح کو دیکھنے والا کوئی نظر نہ آیا تو اس نے ممتاز کے سر کو بھی زور سے مین ہول کے اندر پھینک دیا۔ اور گوشت کے دوسرے ٹکڑوں کو بھی ادھر ادھر سے چن کر مین ہول میں ڈال دیا۔

اس کے بعد وہ فرش پر سے اٹھا۔ اور سامنے میونسپلٹی کے نل پر چلا گیا نل کھول کر اس نے ہاتھ منہ دھویا۔ خاک رویوں کے مندر میں سامنے سے نظر آنے والی گنیش جی کی مورتی کو بڑے ادب سے پرنام کیا۔

اب اسے بڑے زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ وہ ٹرام لائن پر چلتا ہوا ایک ریستوران میں گھس گیا۔ جو نیا نیا کھلا ہوا معلوم ہوتا تھا

آئینے، کرسیاں، سنگ مرمر کے میز کاؤنٹر ـــــ سارا فرنیچر ہی نیا معلوم ہوتا تھا۔

پٹور دھن جھومتا جھامتا سیدھا ریستوران کے اندر گھس گیا۔ اور ایک سپید براق سنگ مرمر کی میز پر مکا مار کے بولا۔

"مجھے سخت بھوک لگی ہے۔ کھانے کے لئے جلدی کچھ لاؤ۔"

ریسٹوران کا مالک سندھی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے لڑکے سے جلدی میں کچھ سندھی میں کہا۔

سندھی لڑکا بھاگتے ہوئے کچن میں گھس گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد پٹور دھن کے سامنے روغن جوش کی ایک پلیٹ اور ایک تندوری نان رکھا تھا۔

پٹور دھن غصّے میں ایک دم بھنّا کے اٹھ کھڑا ہوا۔

اور چیخ کر بولا۔

"کیا تم نہیں جانتے ــــ میں برہمن ہوں ــــ میں گوشت نہیں کھاتا ہوں ــــ"

پٹورہ جھن نے گوشت کی پلیٹ اٹھا کے مالک کے منہ پر ماری اور غصے میں بڑبڑاتا ہوا ریستوران سے باہر نکل گیا۔

○

آخری بس

آخری بس ورسوا کے لئے تیار تھی - گیارہ بج چکے تھے اس کے بعد کوئی بس نہیں جائے گی - گیارہ بجے رات کے بعد جسے ورسوا جانا ہو وہ پیدل جائے یا، دو روپے کی گھوڑا گاڑی بیٹھے۔ یا تین روپے کی ٹیکسی لے - ورسوا اسٹیشن کے بس اسٹینڈ سے تین میل دور ہے۔ راستہ سنسان اور ویران نشیبوں میں سے گزرتا ہے سڑک کے دو رویہ کناڈے بڑے بڑے ڈراؤنے جھاڑ ہیں جو چوری چکاری اور قتل وخون کے لئے بڑی عمدہ پناہ گاہوں کا کام دیتے ہیں۔ چنانچہ اکا دکا مسافر اکثر لوٹے جاتے ہیں اور خودکشی یا قتل کے لئے بمبئی کے لوگ دور دور سے یہاں آتے ہیں جن کا اخباروں میں اکثر چرچا ہوتا رہتا ہے - اس لئے بس اسٹینڈ

پر جو ٹیکسی ڈرائیور ہیں یا گھوڑا گاڑی والے ہیں وہ اکثر سندھ کے مکرانی یا سرحد کے پٹھان ہیں اور ہر وقت اپنے پاس ایک خنجر رکھتے ہیں۔ رات کو اکثر پیئے ہوئے ملتے ہیں اس پر بھی یہ لوگ کبھی اکیلے دکیلے سفر نہیں کرتے، بدمعاشوں اور موالیوں کا کیا بھروسہ بھئی۔!

اس لئے میں گاڑی کے پلیٹ فارم پر پہنچتے ہی بھاگا۔ اور جلدی سے آگے بس میں بیٹھ گیا۔ بس کھچا کھچ بھری ہوئی تھی ـــــ یہ سواری کی بس نہ تھی سامان کی بس تھی۔ دوسری بسوں میں مسافر سامان نہیں لے جا سکتے۔ لیکن سامان والی بس میں سامان رکھنے کی اجازت ہے دوسری بسوں میں پینتیس آدمی سوار ہوتے ہیں اس میں صرف اٹھائیس ـــــ

پھر بھی اس میں اٹھائیس سے زیادہ آدمی ہوں گے۔ میں نے دل ہی دل میں آدمیوں کو گننا شروع کیا۔ بتیس آدمی تھے ـــــ کیا بس کنڈکٹر بتیس آدمیوں کو لے جائے گا۔ آخری بس ہے اکثر بس کنڈکٹر بڑے رحم دل ہوتے ہیں خصوصاً آخری بس کے موقعہ پر زیادہ قانون دانی نہیں بگھارتے۔ چار پانچ آدمی اگر مقررہ تعداد سے زیادہ بھی ہوں تو بٹھا کر لے جاتے ہیں پھر بھی ممکن ہے جھگڑا ہو اس لئے میں خوب اچھی طرح سے جم کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا اور اطمینان سے کھڑکی کے باہر دیکھ کر سیٹی بجانے لگا۔ جیسے بس میں سب سے پہلے میں ہی سوار ہوا تھا۔

بس کنڈکٹر نے اندر آ کے مسافروں کو گنا۔ کہنے لگا۔

"چار آدمی زیادہ ہیں۔ اتر جائیں۔"

بہت سے آدمی ایک دم بول اٹھے۔

"جانے دو نا، بس کنڈکٹر صاحب ـــــ آخری بس ہے بے چارے پیدل کیسے جائیں گے ـ بس کنڈکٹر صاحب!

بس کنڈکٹر نے مسکرا کر گھنٹی بجائی، ڈرائیور نے اپنی سیٹ پر بیٹھ کے پہلے بس کے اندر کی بتیاں گل کیں ـ پھر انجن کو اسٹارٹ کرنے لگا۔ تھوڑی دیر تک انجن کے کھانسنے کی آواز آئی۔ اس کے بعد وہ بھی بند ہو گئی

ڈرائیور نے سوئچ دبا کر اندر کی بتیاں روشن کر دیں اور پھر اپنی سیٹ سے اتر کر انجن دیکھنے لگا۔ مسافروں کے چہروں پر نا اُمیدی دوڑ گئی ـ بس کنڈکٹر نے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔

"ابھی پانچ منٹ میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

یہ کہہ کر وہ بھی بس سے اتر کر ڈرائیور کے پاس چلا گیا

میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔

میری طرح بہت سے دوسرے مسافر بھی گیارہ بجے والی بس پکڑتے ہیں اس لئے اکثر جانے پہچانے چہرے نظر آنے لگے ان میں ڈاکٹر کا تما پرشاد کا چہرہ تھا گول مٹول چہرے پر ایک کمزور سی ٹھوڑی، ایک ڈھیلے سوچ کی طرح لٹک رہی تھی چہرہ مایوس اور تھکا تھکا سا تھا۔

میں نے سوچا ـــــ اس سوچ کو اوپر کرنے کے بعد بھی کیا اس چہرے پر کسی طرح روشنی کی برقی رَو نہیں دوڑ سکتی ـــــ اندر سے میں نے یوں سوچا اوپر سے ڈاکٹر صاحب سے یوں کہا۔

"ڈاکٹر صاحب بڑی دیر سے آ رہے ہیں آپ"

کامتا پرشاد میری طرف دیکھ کے مسکرایا بولا۔

"کیا کروں آج کل کا پیٹیشن بہت ہو رہا ہے۔ کاروبار میں مندہ ہے اور دوکان پر دیر تک بیٹھنا پڑتا ہے۔

کامتا پرشاد کی دندان سازی کی دوکان فارس روڈ اور چینی گلی کی نکڑ پر تھی چینی گلی میں چاؤین دندان ساز کی دکان بھی تھی۔ بڈھا چینی تیس سال سے وہاں جما ہوا تھا اس کی دو بیٹیاں فارس روڈ پر پیشہ کرتی تھیں اور وہ خود دانت بناتا تھا۔ اس لئے بار بار ریٹ کم کرنے کے باوجود بھی کامتا پرشاد آمدنی میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

"میں اپنی لڑکیوں سے پیشہ کیسے کرا سکتا ہوں ـــــ" ڈاکٹر کامتا پرشاد نے شکایتاً مجھ سے کہا۔ اس لئے مجھے دیر تک بیٹھنا پڑتا ہے مگر میں اس سلسلے میں بھی چاؤین کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ وہ تو اپنی دوکان ہی میں سوتا ہے اب میں رات بھر اپنی دوکان کیسے کھول سکتا ہوں ـــــ گیارہ بجے تک دوکان کھولنے کا حکم ہے کھولے رکھتا ہوں اس کے بعد یہ بس بھی مجھے پکڑنا ہوتی ہے ـــــ اتنی دور رہتا ہوں ـــــ"

میں چپ رہا۔

ڈاکٹر نے اک آہ بھر کے کہا

"یہ دنیا کو کیا ہو رہا ہے"

کامتا پرشاد کی ہتھوڑی کا سوچ اور بھی نیچے لٹک گیا۔ اور میرا بہت جی چاہا کہ اس سوچ کو اوپر نیچے ہلا کے دیکھوں کہ کہیں پر زندگی کا کنکشن بھی ہوتا ہے

کہ نہیں مگر پھر یہ سوچ کے رہ گیا۔ آخری بس ہے مجھے بہت دور جانا ہے آخری بس اسٹینڈ سے آگے بھی پندرہ منٹ تک پیدل چلتا ہے۔ اور میں کوئی الیکٹرک کمپنی کا مکینک تو ہوں نہیں کہ ڈھیلے سوچوں کو دبا دبا کر ٹھیک کرتا رہوں جہنم میں جائے ڈاکٹر۔

ڈاکٹر نے میری طرف دیکھ کر بڑے مایوس لہجے میں کہا ــــ "اب تو دن بھر بیٹھے رہو۔ تو بھی گاہک نہیں آتا۔ ہاں رات کو جب فارس روڈ کی گلیوں میں بحری ملاحوں کے ٹولے آنے لگتے ہیں تو اکثر لڑائی دنگا ہو جاتا ہے کسی کا دانت بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ بس سمجھئے کہ عین موقعہ پر لوگ دانت نکلوانے یا بنوانے آجاتے ہیں بس دکان کیا ہے فرسٹ ایڈ کا اڈہ ہے اب تو میں نے فارس روڈ کے ایک حوالی کو کمیشن دے کر راضی کر لیا ہے کہ وہ ٹوٹے ہوئے دانتوں کے سہارے کیس مجھے بھجوا دیا کرے اس پر بھی گزارہ نہیں ہوتا۔

کامتا پرشاد کی بات تین دوکانداروں نے بھی سنی جو اس کے قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے ان میں سے دو سندھی تھے ایک پنجابی تھا۔ بات چیت سے معلوم ہوا کہ تینوں کی دوکانیں ایک دوسرے کے آس پاس واقع تھیں تینوں رو رہے تھے۔ کاروبار کو کیا ہو گیا ہے صبح سے یوں ہی نہیں ہوتی۔ شام کو دو روپے کمائے۔ بس دو روپے۔!

وہ تینوں مکھن لعل مٹھائی والے کی دوکان کے شاکی تھے۔ گاہک کو ادھر آنے ہی نہیں دیتا۔ کم بخت وہیں نکڑ پر سنبھال لیتا ہے ہم منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ جب اس کی اچھی مٹھائی ساری بک جاتی ہے تو گاہک کہیں ہماری طرف

آتا ہے جی چاہتا ہے سالے کی دوکان کو آگ لگا دوں ــــ آج صبح سے کل بارہ آنے کماتے ہیں۔ اب اس میں گھر کیسے چلے گا۔

اس کے بعد وہ لوگ بٹوارے کی باتیں کرنے لگے۔ گھر جو وہ کراچی میں چھوڑ آئے تھے، کھانا جو لاہور میں تھا ــــ ہائے وہ دودھ وہ گھی ــــ وہ آب و ہوا۔ ہماری گورنمنٹ ریفیوجیوں کے لئے کچھ نہیں کرتی۔ مگر پاکستان والے بھائی کچھ بھی کہو۔ ان مسلمانوں میں بڑا ایکا ہے۔

وہ لوگ باتیں کر رہے تھے۔ میں نے نظر گھمائی ــــ کھڑکی سے ٹیک لگائے بیکل ایم، اے ایڈیٹر نلم روزنہ تھا اس کا سوکھا بھورا تیلا چرخ چہرہ بھنگ کے نشے میں سب کو گھورتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ یکایک اس نے نلم روز کی فائل پر ہاتھ مار کے کہا۔

" ہر روز دیر ہو جاتی ہے۔ ہر روز اسی طرح سے دیر ہو جاتی ہے آٹھ دس گھنٹے نلم روز کے دفتر میں کام کرو ــــ جین صاحب کی گھڑکیاں سنو ــــ پھر ڈیڑھ گھنٹے بوری بندر کے ملبے کیو میں بس کا انتظار کرو۔ یہاں پہنچو تو بس خراب ہو جاتی ہے یہ کیا انتظام ہے، کیا سلیقہ ہے ــــ کیا سوراج ہے۔ بسٹ کمپنی کو تالا لگا دینا چاہیئے۔"

بسٹ کمپنی کا ایک ورکر بھی بس میں بیٹھا تھا۔ رومال میں آم باندھے گھر لے جا رہا تھا وہ غصہ میں تاؤ کھا کے بولا۔

" کیا بکتے ہو۔"

بیکل ایم اے نے نلم روزنہ کی فائل پر ہاتھ مار کے کہا۔

"تالا لگا دو — میں کہتا ہوں لبسٹ کمپنی کو تالا لگا دو —"

"کیوں تالا لگا دو —" ورکر بولا

"اس لئے کہ انجن کبھی کبھار خراب ہو جاتا ہے اس میں کمپنی کا کیا قصور ہے"

"کمپنی کا قصور نہیں تو پھر تمہارا قصور ہو گا — جب سے تم ورکروں نے یونین بنائی ہے تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے میں سب اچھی طرح سے سمجھتا ہوں،" بیکل ایم اے بولا

"کیا سمجھتے ہو —"

ورکر غصے میں بولا۔

"تم لوگ ہڑتال کرتے ہو — ڈبل بھتہ مانگتے ہو — مہنگائی کا الاؤنس مانگتے ہو۔ کہاں سے وہ روپیہ آتا ہے؟ ہماری جیبوں میں سے جاتا ہے۔ غریب پبلک کی جیب سے جاتا ہے۔ تم مزدور لوگ مزے کرتے ہو مڈل کلاس بھوکی مرتی ہے" بیکل ایم اے بڑے مزے سے بھنگ کی ترنگ میں کہہ رہا تھا۔

بہت سے سفید پوش بابو نما لوگوں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ان میں کچھ چہرے میں بھی پہچانتا تھا سیٹھ حاجی داؤد ٹھیکیدار تھے جنہیں جوہو پر بلڈنگیں بنانے کا ٹھیکہ ملا تھا ان میں جے جے شاہ تو بھارت کا اسسٹنٹ ایڈیٹر تھا جو اپنی بیوی کے ساتھ پکچر دیکھنے کے بعد واپس آ رہا تھا۔ ان میں ملیالی کرسچین جان تھا جو بی اے پاس کرنے کے بعد بے کار تھا اور نوکری کی تلاش میں گھومتا رہتا تھا اس کی سیاہ مونچھوں کے نیچے سفید دانت اکثر چمکتے دکھائی دیتے تھے۔ اس لئے اکثر اس کے چہرے سے پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ کب غصے

یس ہے اور کب مسکرا رہا ہے۔!

"ہاں دیکھو تا ـــــ ہم بی اے پاس ہوئے ہم کو نوکری نہیں ملتا ہے دو سال سے نہیں ملتا ہے۔ یہ چار جماعت پڑھ کے سالا مجے کرتا ہے اور سوشلزم سوشلزم پکارتا ہے۔ ہماری طرح بھوکا رہے تو سالے کا سب سوشلزم نکل جائے ایک دم ـــــ"

بس کمپنی کے ورکر نے آستینیں چڑھالیں لیکن اس کے قریب ریلوے کمپنی کا ایک مزدور بیٹھا ہوا تھا اس کی نیلی مگر میلی کچیلی تیل کی چکتوں سے داغدار وردی کوئلے کے غبار سے اٹی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر بھی کوئلے کی کالوپنچ تھی جس کے اندر سے اس کی گہری آنکھوں کی روشنی ایک خوفناک سرخی کی طرح چمک جاتی تھی۔

لوگ اس کے کوئلے کے غبار سے بھرے ہوئے کپڑے دیکھ کر اس سے ذرا دور دور بیٹھنے کی کوشش کر رہے تھے ریلوے کمپنی کے مزدوروں نے بس ورکر کو بازو سے پکڑ کے کہا۔

"کیوں بیکار میں جھگڑا کرتے ہو ان لوگوں کو ہماری حالت کیا معلوم۔ جانے دو ابھی تھوڑی دیر میں بس چلے گی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلے گی پھر اس بابو کا دماغ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔

"تم کیا سمجھتے ہو۔ میرا دماغ خراب ہے ـــ"

ملیالی جان غصہ میں بولا اس کے دانت ہونٹوں سے باہر نکل آئے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ ابھی وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگے گا۔ ریلوے کمپنی کے مزدور

کو ہنسی آگئی۔ اس نے منہ پھیر لیا۔

جے جے شاہ نے اپنی بیوی سے کہا۔

"بیٹی ڈیوس کی اداکاری تمہیں پسند آئی۔"

بیوی نے شاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالدیں اور ہولے سے مسکرائی جیسے بیٹی ڈیوس کی اداکاری کو شراب کے گھونٹ کی طرح پی رہی ہو۔

جے جے شاہ نے اپنی بیوی کے بازو میں چٹکی لے کے گجراتی میں کہا۔

"تمہاری آنکھیں بھی تو لیس بیٹی ڈیوس کی طرح ہیں۔"

بیوی نے بڑی ادا سے اپنی آنکھیں مٹکائیں اور گجراتی میں اپنے خاوند سے کچھ کہا۔ جس کا مطلب غالباً یہ تھا۔

"ہٹو پرے۔"

اس کے بعد مسافر ایک دم لیس کمپنی کی شکایت کرنے لگے۔

"یہ کیا مذاق ہے — کیا ہم لوگ رات کے بارہ بجے گھر پہنچیں گے۔ کمپنی کو فوراً دوسری بس کا انتظام کرنا چاہیئے بلکہ ایک فالتو بس ہمیشہ اڈے پر کھڑی رکھنی چاہیئے۔ سالے جنگلی لوگ ہیں۔ ان کو کچھ پتہ ہی نہیں —!"

ایک مارواڑی بزنس مین سوئٹزرلینڈ کی بسوں کا ذکر کرنے لگا۔ جب میں سوئٹزرلینڈ میں تھا۔ ..... لیکن اس کی آواز لوگوں کے شور و غل میں ڈوب گئی اور جب کنڈکٹر شور سن کر اندر داخل ہوا تو سب آوازیں ایک بھوکے کتے کی طرح اس پر جھپٹ پڑیں — ہر ایک چہرہ وحشی اور خشونت آمیز نظر آرہا تھا، دن کی تھکن اور گھٹن، مایوسی محنت کی سوگواری اور بے مقصد

انتظار کا اضمحلال اور غصہ اور جھنجھلاہٹ سے ہر چہرے پر رگیں اور شریانیں یوں ابھر آئی تھیں جیسے سرِ بازار کوئی حادثہ ہو جائے۔ اور بجلی کے بہت سے تار ایک دوسرے سے الجھ کر گر پڑیں۔

ہر شخص اپنی ناکامی کے بخار میں تپ رہا تھا۔ اور جھنجھلا کر اپنا غصہ کنڈکٹر پر اتار رہا تھا۔

کنڈکٹر بھی آٹھ گھنٹے کی مسلسل کھڑے رہنے والی ڈیوٹی سے اکتایا ہوا تھا آوازیں سنتے ہی برس پڑا۔

"تو میں نے کیا جان بوجھ کے بس روکی ہے۔ کیا میں اپنے گھر نہیں جانا چاہتا ہوں۔ کیا میرے بچے نہیں۔ کیا مجھے بھوک نہیں لگی ہے۔ تم لوگ تو ابھی ابھی اپنے اپنے گھروں کو پہنچ جاؤ گے۔ مجھے درسوا سے واپس کولابہ جانا ہوگا۔ یہاں سے بیس میل دور .... اس کا بھی خیال کیا ہے سب اپنی اپنی ہانک رہے ہیں۔"

"ہانک رہے ہیں ——"

جے جے شاہ کو اس دو ٹکے کے بس کنڈکٹر پر بہت غصہ آیا بس میں کھڑا ہو کے چلاتے لگا۔

" ہم ہانک رہے ہیں — اور تم فرما رہے ہو —— ابھی اپنے الفاظ واپس لو۔ ورنہ اخبار میں خبر لوں گا —— تم جانتے نہیں ہو میں کون ہوں"

" کون ہو۔"

بس کنڈکٹر نے غصے سے پوچھا۔

"بمبئی کے گورنر ہو۔"

"میں جے جے شاہ ہوں ——— نو بھارت کا ایڈیٹر ——— پبلک کا نمائندہ ہوں تم نے ہماری بے عزتی کی ہے۔ ہمیں کیا گدھا سمجھا ہے اُلّو۔"

"شٹ اپ ——"

کنڈکٹر نے آگے بڑھ کے کہا۔

"شٹ اپ۔"

جے جے شاہ نے غصہ میں تھر تھر کانپتے ہوئے کہا۔

ریلوے کا مزدور دونوں کے بیچ میں آگیا اتنے میں گیارہ دس کی گاڑی آگئی۔

اور جب ان لوگوں نے دیکھا کہ آخری بس ابھی تک اڈے پر کھڑی ہے تو وہ لوگ بھی بس کی طرف بھاگے۔

"آجاؤ ——— آجاؤ ———"

جنار کریم والے نے اپنے ٹوکرے کو سیٹ کے نیچے دباتے ہوئے کہا۔

بس کنڈکٹر نے لوگوں کو روکنے کی کوشش کی مگر لوگ اندر آتے ہی چلے گئے اب بس کے لوگ کنڈکٹر سے بہت خفا تھے اس لئے کسی نہ کسی طرح سے وہ سکڑ کر وہ آنے والے لوگوں کو اندر جگہ دینے کی کوشش کر رہے تھے تھوڑی دیر میں جہاں بتیس آدمی بیٹھے تھے وہاں اب بیالیس آدمی بھرے پڑے تھے۔

بس کنڈکٹر نے گاڑی سے اتر کر کہا۔

"اب تو اٹھائیس سے اوپر میں ایک آدمی نہیں لے جاؤں گا۔"
"تمہیں سب آدمی لے جانے ہوں گے۔"
شاہ چیخ کر بولا
"ٹھیک ہے ٹھیک ہے"
جنار کرآم والا پسٹن جی بھاجی والا اور مزدور بیکل ایم اے نے چلّا کے شاہ کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ریلوے کے مزدور نے جنار کر سے کہا۔
"یہ کیا دھمالی مچاتے ہو ـــــ اٹھائیس آدمیوں کی بس ہے۔ وہ بتیس لے جا رہا تھا اب تم دوسرے آدمیوں کو اندر آنے کی دعوت دیتے ہو۔" بس اتنا بوجھ کیسے لے جا سکتی ہے عقل کی بات کرو ـــــ"
"ہاں ساری عقل تم میں بھری پڑی ہے۔"
جنار کرآم والے نے بڑی نخوت سے مزدور کے گندے لباس کی طرف دیکھ کے کہا۔ اور گاڑی سے باہر کھڑی ہوئی ایک گورے رنگ کی سندھی عورت سے زور سے کہا۔
"ہاں تم بھی اندر آجاؤ ـــــ یہ بس سب کو لے جائے گی"
بہت سے لوگ ہنسنے لگے بس کنڈکٹر دانت پیس کے رہ گیا بولا
"ابھی پولیس کو بتاتا ہوں ـــــ"
اتنا کہہ کے وہ قریب کے ایرانی ریستوران میں پولیس کو ٹیلی فون کرنے چلا گیا۔
"لانے دو اسے پولیس کو ـــــ"

دربارا سنگھ فلوٹیا جو شراب کے نشے میں دھت تھا بولا۔

" ہم پولیس سے ڈرتے ہیں ، بس والوں سے ڈرتے ہیں ؟ پوچھ لو کسی سے ، دربارا سنگھ کسی سے نہیں ڈرتا ہے ۔ اس روز ہولی کے دن میں نے ایک مدراسی کے منہ پر رنگ مل دیا ۔ سالا بولا ہم تم کو مارے گا ۔ تو میں نے ڈانگ مار کے اس کا سر توڑ دیا ۔ سالا مدراسی بھاگ گیا دوسرے دن پھر میں ملا ــــ سر پر پٹی باندھے تھا میں نے کہا ۔ تم مدراسی ہے ہم دربارا سنگھ ہے ہم تمہارا سر توڑ دے گا ۔ پولیس کو بلاؤ سب کے سامنے تمہارا سر توڑ دے گا ۔

دربارا سنگھ کی پگڑی اتری ہوئی تھی اس کا چہرہ شراب سے سرخ تھا! اس کے گھٹنوں پر اس کا فلوٹ ایک بکس میں بند پڑا تھا ۔

وہ غصّے میں بولا ۔

" یہ سالا بس کیوں نہیں چلاتا ــــ "

ایک آدمی نے دربارا سنگھ سے کہا ۔

" وہ پولیس کو بلانے گیا ہے ۔ "

" بلا کے لائے ــــ پولیس کیا اپنے باپ کو بلا کے لائے دربارا سنگھ سب کا سر توڑ دے گا ۔ اسی دن وہ مدراسی ......

بہت سے لوگ دربارا سنگھ کی تعریف کرنے لگے ۔

" بڑا جی دار آدمی ہے جی ــــ بے خوف ۔ بے جگر ، اکیلے ہی دس آدمیوں کا مقابلہ کر سکتا ہے ۔ "

دربارا سنگھ نے خوش ہو کے کہا۔

" پوچھ لو۔ اسی مڈراسی سے پوچھ لو —— " وہ بولا

" تم ہم کو مارے گا۔ میں نے کہا۔ ہاں — ہم تم کو مارے گا۔"

آج بھی مارا کل بھی مارے گا —— !

" ہمارا نام دربارا سنگھ فلوٹیا ہے۔ سارا بمبئی ہم سے ڈرتا ہے۔

ہنکار کر نے کہا۔

" اس بس کنڈکٹر کے بچے کو تو اب ایسا مزا چکھاؤں گا کہ یاد ہی کرے گا۔"

تھوڑی دیر میں بس کے بہت سے آدمی ایک ساتھ باتیں کر رہے تھے ہر شخص اپنی اپنی بہادری اور بے جگری کی من گھڑت داستانیں سنا رہا تھا صرف ایک ریلوے کا مزدور چپ بیٹھا تھا لوگوں نے اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔

میں نے بھی اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ میری نگاہیں گورے رنگ کی بڈھی سندھی عورت پر تھیں جو واقعی کسی زمانے میں بڑی خوبصورت ہو گی۔ اس کے قریب ایک نو بیاہتا جوڑا بیٹھا تھا۔ جو دوسری گاڑی سے آیا تھا وہ جوڑا دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کے صرف ایکدوسرے کو دیکھنے میں مصروف تھا۔

میں بھی یکایک بس کے سارے منظر کو بھول گیا —— کیسی خوبصورتی تھی دس سال کے بعد بمبئی میں ایسی موہنی صورت دیکھنے کو ملی اسے دیکھ کر میں بس سے اٹھ کر کہیں بہت دور چلا گیا اور میرے ذہن میں وہ گلاب کھلنے لگے

جو کبھی تیرے ہونٹ تھے وہ نورس کلیاں جو تیری باتیں تھیں، وہ بوسے جو کبھی میرے تھے۔ کیا وہ جھرنا ابھی تک بہہ رہا ہے کیا تو اسی طرح وہاں سیب کی ڈالی کی طرح جھکی ہوئی کھڑی ہے۔ کیا تیرے دل میں میری محبت کے شگوفے ابھی تک لرز رہے ہیں۔ کیا تیری آنکھوں کے نیلگوں آسمان پر میرے دل کا حیران حیران تارا ابھی تک ڈول رہا ہے.....

کہاں ہے تو اے میری گزری ہوئی محبت کی پچیس سالہ بازگشت، تو کیوں اس وقت رات کے سناٹے میں اک دور جانے والی گاڑی کی صدا کی طرح مجھے چونکانے آئی ہے۔ اپنی یاد کو واپس لے جا کیونکہ اب مجھے میرے لئے کچھ نظر نہیں آتا۔ کوئی گلاب نہیں ہے، کوئی تارا نہیں ہے اور کوئی شگوفہ نہیں ہے۔ میں ہوں۔ زندگی کا بس اسٹینڈ ہے۔ اور آخری بس کا انتظار ہے۔

آدمی خدا کو بھی معاف کر دیتا ہے لیکن محبت کبھی معاف نہیں کرتی۔ میں نے اس لڑکی اور لڑکے کو ایک دوسرے پر جھکتے ہوئے ایک دوسرے کے کانوں میں باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔

"نہیں — نہیں۔"

"یہ وہ نہیں ہے۔ ہرگز ہرگز وہ نہیں ہے۔ مجھے اس کی طرف دیکھنا بھی نہیں چاہیئے۔"

میں نے نگاہیں پھیر لیں — اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

بس کنڈکٹر ایک پولیس انسپکٹر اور اسٹیشن لائن کے تین سپاہیوں کو لے کے آ رہا تھا۔

یکایک لوگوں کا شور ختم گیا۔ چہرے خوفزدہ ہو گئے۔ جبار کرا اور دربارا سنگھ
نلوٹیا جو سب سے بڑھ چڑھ کے باتیں کر رہے تھے یکایک ایسے چپ ہو گئے
جیسے ان کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ جے جے شاہ بار بار اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھنے
لگا۔ اس کی بیوی گجراتی زبان میں غالباً اسے تسلی دیتی جاتی تھی۔

پولیس انسپکٹر نے آتے ہی گرج کر کہا۔

"اتنے فالتو آدمی یہاں کیوں بیٹھے ہیں نکالو ان سب کو۔"

سب لوگ چپ چاپ بیٹھے رہے ان میں سب سے زیادہ چپ دربارا سنگھ
نلوٹیا تھا۔

"کون کون دیر سے آیا ہے۔"
انسپکٹر نے سختی سے پوچھا
سب لوگ چپ رہے۔
انسپکٹر نے گھوم کر بس کنڈکٹر سے کہا۔
"تم بتاؤ نا میں اب کس کس کو نکالوں کس کو رکھوں"
بس کنڈکٹر نے جے جے شاہ کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ آدمی دیر سے آیا ہے۔"
جے جے شاہ نے کانپتے ہوئے غصے سے کہا

"جھوٹ بولتا ہے۔ انسپکٹر صاحب۔ میں تو کب سے اس گاڑی میں بیٹھا ہوا
ہوں اپنی بیوی کے ساتھ پوچھ لو اس سے ——— " اس نے اپنی بیوی کی طرف
اشارہ کیا۔

انسپکٹر مسکرایا۔ بولا
"تم نیچے آجاؤ۔۔"
"مگر۔
"اگر مگر نہیں چلے گی۔
"مگر میرے ساتھ میری بیوی ہے۔
بیوی بولی
"میں بس میں گھر پہنچ جاؤں گی۔ تم خواہ مخواہ جھگڑا مت کرو۔"
جے جے شاہ نے گھور کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور پھر آہستہ سے بولا
"میں تو بھارت اخبار کا ایڈیٹر ہوں میں پبلک کا نمائندہ ہوں۔۔ میں سمجھ لونگا۔
پولیس انسپکٹر نے کہا۔
"میں خود بہت تھکا ہوا ہوں۔ اب اپنی ڈیوٹی چھوڑ کے جانے والا تھا۔ کہ یہ
آ گیا۔
"مجھے مت ستاؤ۔ جلدی جلدی بولو۔۔ کون دیر میں آیا ہے۔
کوئی نہیں بولا۔
بس کنڈکٹر نے جنا رام والے کی طرف دیکھ کر کہا۔
"یہ بھی دیر سے آیا ہے۔
" ۔۔ ۔۔"
۔۔ صاحب جھنجھلا کر گڑگڑا کر بولا
میں تو بس میں سب سے پہلے گھسا تھا۔ بس اک دم خالی تھا۔ جب میں گھسا

"باہر نکلو ـــــ"

انسپکٹر بولا

"یہ دربارا سنگھ ـــــ"

بس کنڈکٹر دربارا سنگھ کا نام تک جانتا تھا۔

دربارا سنگھ خاموشی سے اپنی پگڑی اور نلوٹ سنبھال کے اتر گیا۔

"وہ مدراسی ......"

بس کنڈکٹر نے چاروں طرف گھور کے دیکھا۔ میرا رنگ فق ہو گیا۔ مگر میں کسی نہ کسی طرح مسکراتا رہا۔

بس کنڈکٹر نے آگے بڑھ کے پشٹن جی بھاجی والے کو اتار دیا۔

جب وہ کنی لال دھوبی کو اتارنے لگا تو اسے بہت غصہ آیا کنی لال دھوبی نے اسے سرزنش کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"آنا کبھی رات نہ بنگلے کی طرف تیری اچھی طرح سے تکا بوٹی ......"

بس کنڈکٹر نے گھبرا کر پولیس انسپکٹر کی طرف دیکھ کے شکایتاً کہا۔

"سن لیجئے حضور سن لیجئے ـــــ ابھی سے دھمکیاں دے رہا ہے"

"کیا کہا ـــــ"

پولیس انسپکٹر نے گرج کر کہا۔ اس نے کنی لعل کو شانے سے پکڑ لیا اور ایک سپاہی سے کہا۔

"اسے تھانے لے جاؤ ـــــ اور ڈبل چارج مارو۔"

"نہیں حضور نہیں حضور میں تو آپ کا غلام ہوں ـــ" کنی لال گڑگڑانے لگا۔

بس کنڈکٹر پھر مجھے گھورنے لگا۔ میں اس کی طرف دیکھ کے مسکرایا اور اسے ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ جب وہ میری طرف جھکا تو میں نے بھی اس کی طرف جھک کے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"وہ جو آدمی کھڑکی کے باہر دیکھ رہا ہے"

میں نے ڈاکٹر کامتا پرشاد کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

"وہ دوسری گاڑی سے آیا تھا۔"

بس کنڈکٹر نے ڈاکٹر کامتا پرشاد کے کندھے پر جھپٹا مار کے کہا۔

"نکلو باہر۔"

"مگر میں۔ سچ کہتا ہوں ـــــ میں سب سے پہلے۔ پوچھ لو، اس سے.... ڈاکٹر نے میری طرف اشارہ کرکے کہا۔

"میں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔"

اس لڑکی اور لڑکے کو نکالنے کی جرأت بس کنڈکٹر میں نہ تھی وہ کئی بار ان کے پاس سے ہو کر چلا گیا۔ کئی بار وہ ان کے پاس آکے ٹھٹکا ـــ رکا ـــ پھر گھبرا کے آگے چلا گیا۔

کئی بار وہ محبت کے ساحل پر آکر رکا۔ مگر وہ محبت ایسی والہانہ تھی ایسی اپنے میں کھوئی ہوئی تھی ایسی اس سے بیگانہ تھی ایسی اپنی سرمستی میں سرشار تھی۔ دل کے دروازوں کو بند کرکے ایسی بے سدھ ہوئی پڑی تھی۔ کہ بس کنڈکٹر کو دروازے پہ کھٹکھٹانے کی ہمت نہ پڑی۔

وہ چپ چاپ آگے بڑھ گیا۔

اور دوسرے دو چار آدمیوں کو باہر بھیجنے لگا۔ وہ لوگ اللہ اور بھگوان کی گواہی پیش کر رہے تھے۔ مگر بس کنڈکٹر کے کان بہرے ہو چکے تھے۔ اس وقت وہ صرف سمندر کا نغمہ سن رہا تھا۔

"اب گنو ــــ"

انسپکٹر نے بس کنڈکٹر سے کہا۔

بس کنڈکٹر نے مسافر گنے ــــ انتیس مسافر تھے۔ مجھے تو اب وہ کسی طرح نہ نکال سکتا تھا۔ میرے اور اس کے درمیان میر جعفر کا رشتہ قائم ہو چکا تھا بس وہی گورے رنگ کی سندھی عورت رہ گئی تھی جو واقعی دیر سے آئی تھی۔ وہ وقتی ہمیشہ دیر سے آتی تھی۔

اسے اڈے پر سب جانتے تھے۔ یہ بڑھیا ایک نائٹ اسکول میں ایک غریب استانی تھی اور سب سے آخر میں بس اسٹینڈ پر پہنچتی تھی۔ اس کے پاس ہمیشہ ایک بڑا تھیلا ہوتا جس میں آلو، ٹماٹر، پیاز اور دوسری سبزترکاریاں بھری ہوتیں۔ وہ بیوہ تھی اور ہمیشہ سفید کپڑے پہنتی تھی جس پر اکثر پیوند لگے ہوئے تھے۔

بس کنڈکٹر نے بادل نخواستہ اس سے کہا۔

"تم بھی اتر جاؤ ماں جی۔"

"پھر میں اس وقت کہاں جاؤں گی۔ کیسے گھر پہنچوں گی"

پولیس انسپکٹر نے کہا۔

"میں کیا کر سکتا ہوں ــــ یہ میونسپل کمیٹی کا حکم ہے"

"مگر بچہ میرے پاس ٹیکسی کے پیسے نہیں ہیں۔ میں تین میل پیدل کیسے

جا سکتی ہوں۔ رات کے بارہ بجے ہیں بچے۔ مجھے جانے دو۔ میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔"

وہ پولیس انسپکٹر کے پاؤں چھونے لگی۔

پولیس انسپکٹر نے جلدی سے پاؤں پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"میں مجبور ہوں۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

"بس کنڈکٹر نے شکایت کی ہے میں اٹھائیس سے زیادہ آدمیوں کو اس میں سوار نہیں ہونے دوں گا۔ تم نیچے اتر جاؤ۔"

"بھگوان کے لئے مجھے جانے دو ——"

بڑھیا گڑگڑانے لگی۔

"میں دس بجے نائٹ سکول سے فارغ ہوتی ہوں۔ گیارہ بجے یہاں پہنچتی ہوں ابھی گھر جا کے اپنا کھانا بناؤں گی ایک بیوہ پر ترس کھاؤ۔"

بڑھیا رونے لگی۔

پولیس انسپکٹر نے بس میں بیٹھے ہوئے آدمیوں کی طرف دیکھ کے کہا۔

"اگر آپ میں سے کوئی ایک آدمی اتر جائے اور اس عورت کو جانے دے تو مجھے اس میں کوئی اعتراض نہ ہو گا۔"

کوئی اپنی سیٹ سے نہیں ہلا۔ نہ حاجی داؤد —— نہ بے کل۔ ایم۔ نہ وہ مار واڑی جو سوئٹزرلینڈ سے ہو کے آیا تھا۔ نہ وہ سندھی دوکاندار —— گاڑی میں سب لوگ بڑے اطمینان سے بیٹھے رہے اور کھڑکیوں سے باہر دیکھنے لگے جیسے پولیس انسپکٹر ان سے نہیں خلا میں کسی سے مخاطب ہو۔ آخر سب کو گھر

جانا ہے۔

پولیس انسپکٹر نے بڑھیا سے کہا۔

"کوئی نہیں اٹھے گا۔ تمہیں نیچے اترنا پڑے گا۔"

بڑھی نے سسکیاں لیتے لیتے اپنے جھولے کو سنبھالا اور چاروں طرف بس کے بے رحم مسافروں کی طرف دیکھا اور پھر مڑ کر آہستہ آہستہ بس کے باہر جانے لگی۔

یکایک وہ نیلی وردی والا میلے کچیلے تیل کے دھبوں والا انجن میں کوئلے جھونکنے والا مزدور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے آہستہ سے بڑھی استانی کو روک کر کہا—

"تم اس سیٹ پر بیٹھو ماں — میں اتر جاتا ہوں۔"

اتنا کہہ کر اس نے ایک قہر آلود نگاہ سے بس میں بیٹھے ہوئے خوش پوش آدمیوں کی طرف دیکھا۔

اس کے سیاہ چہرے پر اس کی آنکھیں دو سرخ بتیوں کی طرح چمک رہی تھیں وہ کچھ کہنا چاہتا تھا پھر اس نے اپنے آپ کو روک لیا اور خاموش ہو کے لنگڑاتا ہوا اپنی سونٹی کا سہارا لیتا ہوا نیچے اتر گیا۔

اُس کی بائیں ٹانگ پر پٹی بندھی تھی۔

شاید وہ نیچے نہیں اترا تھا۔ اس نے بہت سے لوگوں کو ان کے ضمیر کی سیڑھی سے نیچے اتار دیا تھا۔ کیونکہ جب بس چلی تو یہ شخص اپنی سیٹ پر چپ چاپ خوفزدہ بیٹھا تھا۔

بیچک نہ دگنجن جو بمبئی ٹاکیز میں کام کرتا ہے - اس سے یہ خاموشی سہاری نہ گئی -

اس نے میری طرف جھک کے بڑے رازدارانہ لہجے میں مسکرا کر کہا-

" بھائی آپ بھی تو دیر میں آئے -"

میں نے گرج کر کہا -

" میں کہاں دیر سے آیا - ؟"

گنجن میرے گرجنے پر حیران سا ہو گیا - پھر وہ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولا -

" ہاں بھائی صاحب آپ پہلے آئے تھے مجھ سے غلطی ہو گئی -

" تم ہمیشہ غلطی کرتے ہو ـــ"

میں نے چلّا کے کہا -

گنجن چپ ہو گیا

گاڑی میں کوئی نہیں بولا

بس موڑ پر سے گزری -

اور ـــ لنگڑاتے ہوئے مزدور کو پیچھے چھوڑ گئی

کھڑکی سے باہر دیکھنے والے لوگوں نے یکایک اپنے چہرے اندر کر لئے ـــ

لیکن مزدور کی سونٹی کی ٹک ٹک ان کے دلوں کے سخت فرش پر اک ہتھوڑے کی ضرب کی طرح بجتی گئی -

اب ہر شخص اپنی جگہ پر شرمندہ محجوب ایک بید زدہ کتے کی طرح دم دبائے چپ بیٹھا تھا۔

یکایک مجھے محسوس ہوا۔ جیسے یہ بس آگے نہیں پیچھے چل رہی ہے اور وہ مزدور ہم سے کہیں بہت دور آگے جا رہا ہے۔

کیا کروں؟

ساڑھے نو کے قریب سردار سدا بہار سنگھ کے فلم پروڈکشن نمبر ا چل چل رے کوچوان کے پہلے دو گانوں کی صدا بندی لکشمی سٹوڈیو میں ختم ہو گئی۔ سردار سدا بہار سنگھ فلم انڈسٹری میں نووارد تھا۔ اس لئے صدا بندی سے پہلے ماسٹر جھمن راؤ نے گیت گانے والی مس دھنا سری نے اور ساز بجانے والوں نے اپنے پیسے وہیں اسٹوڈیو میں وصول کر لئے صدا بندی کے فوراً بعد ساز بجانے والوں کو خیال آیا کہ اس موقع پر سب سے قریب کا شراب خانہ رے روڈ پر پڑے گا۔ یوں تو سبھی پینے والے تھے لیکن چھوٹی آنکھوں اور لمبی ڈاڑھی والا سر مکھ ڈھولکیا اور وائیلن بجانے والا ڈی میلو اور بانسری بجانے والا نواز جو خود بھی اتنا دُبلا تھا کہ دُور سے دیکھنے پر اگر وہ خود بھی ایک چلتی پھرتی بانسری نہیں تو بانس کی

کبھی ضرور نظر آتا تھا۔ یہ تینوں اس وقت بُری طرح پیاسے نظر آ رہے تھے، انہیں اس وقت لکشمی اسٹوڈیو سے رے روڈ کے شراب خانے تک پیدل جانا بھی کھل رہا تھا۔ اسی لئے ان تینوں نے ماسٹر اچھن راؤ کی بے کار کو گھیر لیا حالانکہ اس میں اس وقت ماسٹر جی کی محبوبہ مس دھناسری بھی بیٹھی ہوئی تھی مگر شراب کا عشق عورت کے عشق سے کوئی کم نہیں ہوتا اور پینے والے تو کہتے ہیں شراب کا نشہ عورت کے نشے سے برتر اور فائق ہوتا ہے۔

بہرحال یہ ایک لمبی بحث ہے جو صدیوں سے جاری ہے اور شاید صدیوں آگے چلتی رہے گی اس لمحے میں تو یہ تینوں مس دھناسری کا سب ادب واحترام کھو کر ماسٹر اچھن راؤ سے التجا کر رہے تھے کہ وہ انہیں ذرا کی ذرا میں رے روڈ کے شراب خانے پر اتار دے۔

"تجھ پر سائیں بابا مہربان ہو ماسٹر —" سر مکھ سنگھ میراثیوں کے انداز میں بولا۔

ماسٹر اچھن راؤ نے مسکرا کر دھناسری کی طرف دیکھا۔ سانولے رنگ کی، ایک نازک لڑکی۔ آنکھیں جھکائے ایک کونے میں دبکی پڑی تھی اس نے ماسٹر اچھن راؤ کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ لیکن اچھن راؤ کو معلوم تھا کہ مس دھناسری اس وقت اس گاڑی میں ایک لمحے کے لئے ان سانڈوں کی موجودگی کو برداشت نہیں کر سکتی۔

صورت حال نازک تھی — اِدھر سانڈوں کا پیہم اصرار، ادھر سانولی صورت کا خاموش احتجاج —!

ماسٹر اچھن راؤ نے ایک زور کا قہقہہ لگا کر کہا۔

"بیٹھ جاؤ گاڑی میں کمبختو! سائیں بابا کی قسم دے کے کہتے ہو تو میں کیسے ٹال سکتا ہوں، کیوں جانیاں؟"

ماسٹر اچھن راؤ نے اپنے کالے بالوں والا موٹا کھردرا ہاتھ مس دھناسری کے نازک کندھوں پر رکھ کر کہا۔ اور موٹر اسٹارٹ کر دی۔

سائیں بابا کا نام سنتے ہی دھناسری راؤ کے کاندھے سے لگ گئی سائیں بابا بمبئی کا سب سے بڑا پیر ہے ہندوؤں مسلمانوں سکھوں عیسائیوں، سب کا پیر ہے بمبئی ایسی کاسمو پالیٹن جگہ میں جہاں ہر مذہب ملت اور ہر خیال کے لوگ بستے ہیں وہاں ایک کاسمو پالیٹن فقیر کی بھی ضرورت ہے جو سائیں بابا نے پوری کر دی ہے۔

خاص طور پر فلم انڈسٹری کے لوگ تو سائیں بابا کے دیوانے ہیں تقریباً ہر پکچر کی مہورت سے پہلے سائیں بابا کے مزار پر نیاز اور چڑھاوا چڑھایا جاتا ہے پکچر کے دوران میں پھولوں کی چادریں بھیجی جاتی ہیں۔ پکچر اگر کامیاب ہو جائے تو اسے سائیں بابا کا معجزہ سمجھا جاتا ہے فیل ہو جائے تو اپنی حماقت کا ثبوت دونوں صورتوں میں سائیں بابا پر کسی طرح سے حرف نہیں آتا۔

انسانوں اور خداؤں میں یہی فرق ہے آپ انسانوں پر الزام لگا سکتے ہیں خداؤں پر کوئی الزام نہیں لگا سکتے۔ اسلئے اچھن راؤ کی جانیاں مس دھناسری خاموش ہو کے رہ گئی۔

رے روڈ کے اڈے پر اچھن راؤ نے گاڑی کا پٹ کھول کے سر نکھ

سنگھ ڈی میلو اور نواز کو آتار دیا۔ وائیلنا زڈی میلو جس کی ٹھوڑی دوران گفتگو میں بھی گردن کے ساتھ ایسا زاویہ قائم کرتی ہے جیسے وہ اب بھی کسی وائیلن پہ ٹکی ہوئی ہے۔

مشکرا کر کہنے لگا۔

" ماسٹر ایک گلاس ہمارے سادہ پینا منگتا۔ "

" نہیں نہیں ڈی میلو ـــــ "

اچھن راؤ نے اپنی محبوبہ کی طرف دیکھ کے کہا۔

" اب رکوں گا تو ہماری جانیاں خفا ہو جائیں گی ـــ کیوں جانیاں "

اور یہ کہہ کے اچھن راؤ نے ایک زور کا قہقہہ لگایا۔

جب اچھن راؤ قہقہہ لگاتا ہے تو اس کا جسم یوں کانپنے لگتا ہے جیسے بھونچال آ رہا ہو۔ عام طور پر لوگ قہقہہ لگاتے ہی نہیں۔ جو لگاتے ہیں اتنا مختصر لگاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی قہقہہ نہیں ہے مینڈک ہے جسے انہوں نے اپنے منہ میں دبا رکھا ہے ذرا منہ کھولا اور قہقہہ غڑاپ سے باہر،

کچھ لوگ بے آواز قہقہہ لگاتے ہیں۔ محض منہ ہونٹوں سے تالو تک کھلا ہوا ہے اندر سانس کی نلکی تک نظر آ رہی ہے۔ مگر آواز نہیں آ رہی ہے صرف آنکھوں کے بار بار کھلنے اور بند ہونے سے معلوم ہو رہا ہے کہ مریضہ پر قہقہہ طاری ہے کچھ لوگ قہقہے میں آواز لگالتے ہیں مگر یہ آواز اکثر اتنی پتلی، ننھی یا باریک سی ہی ہی قسم کی ہوتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ

آواز بھیجھڑوں سے نہیں آنتوں سے نکل رہی ہو'

لیکن اچھن راؤ کا قہقہہ اس قسم کا قہقہہ نہیں ہے اس کا قہقہہ اس کے جسم کی طرح بھاری بھرکم ہے۔ وہ جب قہقہہ لگاتا ہے۔ تو اس کے جسم کی پوری عمارت ہلنے لگتی ہے۔ اس کے جسم کا رُواں رُواں قہقہے کی سرمستی و سرشاری میں شامل ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قہقہہ ایک فوارے کی طرح آتشبازی کے انار کی طرح اس کے سارے جسم سے پھوٹ رہا ہے۔ ہو ہو ہا ہا ہا کی فلک شگاف آواز بڑھتی ہی چلی جاتی ہے یہاں تک کے دوسرے لوگوں کو بھی بلا وجہ اس کے قہقہے میں شریک ہونا پڑتا ہے۔ اچھن راؤ کا قہقہہ بڑھتا رہتا ہے۔

اس وقت یہی ہوا۔ قہقہے کے بیچ میں سیلوڈی اور نواز کو بھی شامل ہونا پڑا ہنستے ہنستے سُرمکھ سنگھ کی داڑھی کے کلپ کھل گئے۔ سڑک پر لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہونے لگا۔ حالانکہ ہنسنے کی کوئی بات نہ تھی لیکن قہقہہ تھا کہ امڈا ہی چلا آرہا تھا۔

پھر پولیس کے سنتری کی آمد نے قہقہے کو بریک لگائی اور اچھن راؤ نے اپنے ساتھیوں سے معافی مانگی اور اپنی جانیاں کوے کے چلا گیا اور یہ تینوں ساتھی رے روڈ کے شراب خانے میں داخل ہوئے۔

رے روڈ کا شراب خانہ ایک دو منزلہ عمارت میں واقع ہے نچلی منزل پر بار ہے۔ اوپر کی منزل پر الگ الگ کمرے ہیں جہاں ضرورت مندوں کے لئے تفریح کا سامان مہیا کیا جاتا ہے بہت ہی گھریلو سی فضا ہے۔ اس شراب خانے

کی - ویٹر حلیم اور بردبار ہیں ۔ شکل وصورت سے پیشہ ور سیاستدان معلوم ہوتے ہیں میزیں نہ بہت صاف ہیں اور نہ بہت گندی ہیں قیمتیں نہ بہت زیادہ ہیں نہ بہت کم ۔ ہر طرح کی شراب ملتی ہے اسی ملک سے ے کے رم تک اور رم سے ے کے ٹھرّے تک زندگی بہتی چلی جاتی ہے ۔

مزدور، کلرک پیشہ، دوکاندار، فلمساز اور وسط درجے کے سرمایہ دار انجنیئر طالب علم مختلف کونوں میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں فضا میں تمباکو اور شراب کی بدبو ہے بکوڑیوں اور کبابوں کی باس ہے مونگ پھلی کے گھی میں فرائی کئے جانے والے انڈوں کی بساند ہے ۔ سگریٹوں کے دھوئیں میں ملی جلی سالنوں کی نمی پیتر تی سی معلوم ہوتی ہے ۔ دیواروں پر مہاتما گاندھی جواہرلال نہرو اور سائیں بابا کے کلینڈر ہیں پارسی بارمین کی موٹی سرخ ناک پر نیلی وریدوں کا جال پھیلا ہوا ہے ۔ کبھی کبھی اوپر کی منزل سے کوئی نقرئی قہقہہ تیرتا ہوا آتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک لمحے کے لئے بادلوں کے غبار میں سے بجلی چمک گئی ۔ نیچے بار میں سب کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں چہرے ایک لمحے کے لئے اس بجلی کی روشنی سے چمک اٹھتے ہیں کوئی خوبصورت خواب کوئی اندرونی تڑپ کوئی جذبۂ پنہاں مچل کر بیدار ہو جاتا ہے ۔ شوق کی زلف بکھر جاتی ہے اور دیر تک امید کے ماتھے پر لرزتی رہتی ہے اب وہ قہقہہ کسی بوسے میں گھل گیا ہے ——— وہ بجلی غائب ہو گئی ۔ لیکن ماتھے پر وہ زلف ابھی تک لرز رہی ہے ۔

نوازنہ سر مکھ سنگھ اور ڈی میلو نے بار میں داخل ہوتے ہی چاروں طرف

نظر دوڑائی۔ کہیں کوئی میز خالی نہ تھی صرف ایک کونے میں جہاں دیوار کے اوپر مس کجن فلم ایکٹریس کی تصویر الٹی ٹنگی ہوئی تھی وہاں ایک میز خالی تھی۔

وہ تینوں جلدی سے ادھر لپکے ـــ بیرا ان کے پیچھے لپکا۔ وہ ابھی بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ بیرے نے آکر بہت لجاجت سے کہا۔

"حضور یہ میز دی جا چکی ہے۔"

"کس کو ـــ؟"

سر مکھ نے ڈاڑھی میں کلپ لگاتے ہوئے کہا۔

"ایک صاحب ہیں"

"چار کرسیاں ہیں۔ ہم تین ہیں۔ پھر بھی ایک کرسی خالی رہتی ہے ـــ" نواز نے ذرا غصے سے کہا۔

"مگر یہ میز تو دی جا چکی ہے حضور"

ڈی میلو نے وائلن کا کیس دیوار پر لٹکاتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ جب وہ صاحب آئیں گے ہم اٹھ جائیں گے جب تک تم تین بڑے سکاچ لاؤ۔"

"ارے یہ کس نے مس کجن کی تصویر الٹی لٹکا رکھی ہے؟"

نواز نے دیوار پر ٹنگی ہوئی تصویر کو ٹھیک کیا۔ "حیرت ہے کسی کو اس طرف خیال نہیں آیا کہ ....

"لو بیٹھو ـــ"

تین بڑے سکاچ آ گئے تھے ڈی میلو، نواز اور سر مکھ نے جلدی سے

گلاس اٹھائیے۔

سرمکھ کے پیاسے ہونٹوں اور پیاسی آنکھوں کے درمیان شاید کوئی رستہ تھا جہاں سے شراب اس کے ہونٹوں سے گزر کر سیدھی اس کی آنکھوں میں پہنچ جاتی تھی۔ دوسرے ہی گھونٹ میں اس کی آنکھیں شرابی ہو گئیں۔" بڑے ہی مزے میں بولا۔

" یہ شراب خانہ ہے درست! یہاں تھوڑی دیر میں ہر چیز الٹی دکھائی دینے لگتی ہے تم مس کجن کی تصویر کو رو رہے ہو۔۔۔ یہاں اپنے درست الٹے نظر آنے لگتے ہیں "

اوپر کے کسی کمرے سے کسی لڑکی کے ہنسنے کی آواز آئی۔

سرمکھ سنجیدہ ہو گیا۔ آہستہ سے بولا

" وہ سالا تو اپنی جانیاں کے ساتھ چلا گیا۔۔۔ ہم کس کے ساتھ جائیں "

سرمکھ کے لہجے میں بہت افسردگی اور ناامیدی تھی۔ اس نے جلدی سے گلاس خالی کر دیا اور بیرے کو دوسرے پیگ کے لئے کہا۔

" اتنی جلدی نہ چلو۔۔۔"

نواز نے مشفقانہ لہجے میں کہا۔

" بہت اچھا میرے باپ۔۔۔"

سرمکھ نے ہاتھ جوڑ کے ڈاڑھی ہلاتے ہوئے کہا۔

اتنے میں ایک دبلا پتلا لانبا آدمی ہاتھ میں چھانٹا لئے چلتا ہوا ان کی میز کے قریب آیا اس کے ساتھ ساتھ وہی بیرہ آ رہا تھا۔

بیرے نے کہا۔

"یہ حضور کی میز ہے"

سر مکھ سنگھ اور نواز کھڑے ہو گئے۔ ڈی میلو ابھی کھڑا ہونا چاہتا تھا کہ اس آدمی نے بہت میٹھی اور دھیمی آواز میں کہا۔

"نہیں، آپ اپنا گلاس ختم کر لیجئے۔ جب تک میں یہاں کونے میں کھڑا رہتا ہوں"

نواز نے اس آدمی کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ سر پر گول ٹوپی۔ بند گلے کا گہرا نیلا کوٹ، ڈک کی سفید پتلون جس کے پائنچے ٹخنوں سے اوپر تھے جوتے میلے اور سیاہ۔ چہرے پر مونچھیں بھی میلی اور سیاہ تھیں اور کونے گرے ہوئے تھے۔ آنکھیں بھی بہت میلی اور سیاہ تھیں اور متذبذب، کہیں ایک جگہ نہ ٹھہرتی تھیں وہ بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر اپنی زبان پھیر رہا تھا اس کا ماتھا تنگ اور گھٹا ہوا تھا۔ اور اس پر گہرے فکر کی شکنیں ابھر آئی تھیں نواز کو وہ آدمی مریض معلوم ہوا۔

اس نے خالی کرسی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"آپ کھڑے کیوں ہیں۔ یہاں بیٹھ جائیے نا۔ ہمارے دوست نے دوسرا پیگ منگا لیا ہے اگر کوئی ہرج نہ ہو تو ہم بھی ——— اور وہ بھی اگر آپ ہی اجازت دیں تو ہم بھی دوسرا پیگ منگا لیں ——— آپ کیا پئیں گے۔"

"کوئی ہرج نہیں ہے ———"

اس آدمی نے ٹوپی اتار کر میز پر رکھی چھاتا کونے میں ٹکا دیا اور خود ہی کرسی پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

"میرے بیرے کو معلوم ہے - میں کیا پیتا ہوں۔ دو کتوں والی رم"

دو کتوں والی رم بار میں سب سے گھٹیا رم مانی جاتی تھی۔ جب بیرے نے بوتل سامنے لاکے رکھی تو اجنبی نے پہلا پیگ انڈیل کے پی لیا پھر دوسرا پی لیا پھر تیسرا پینا چاہتا تھا کہ نواز نے کہا۔

"تو کیا آپ اس حساب سے رم کی تین بوتلیں پئیں گے"

تیسرا پیگ پی کے اجنبی نے کہا

"نہیں صرف ایک پیتا ہوں ـــ اور کسی کسی دن جب ذہن پہ بار زیادہ ہوتا ہے تو ڈیڑھ پیتا ہوں ـــ وہ بھی پی لیتا ہوں ـــ"

چوتھا پیگ انڈیلتے ہوئے اجنبی کی نظر سامنے دیوار پر گئی۔ وہ فوراً غصے میں اٹھ کھڑا ہوا بولا۔

"یہ تصویر کس نے الٹی لٹکائی ہے۔"

سرلکھ نے کہا۔

"الٹی نہیں سیدھی لٹکائی ہے۔ میں نے سیدھی کی ہے الٹی ٹنگ رہی تھی۔"

اجنبی اپنی کرسی کو ڈھکیل کے دیوار کی جانب چلا گیا اس نے مس کجن کی سیدھی تصویر کو پھر الٹا کر کے لٹکا دیا اور کہنے لگا۔

"یوں نہیں ـــ یوں سیدھی ہے"

اس پر سرلکھ کو بہت غصہ آیا۔ اس نے اٹھ کر مس کجن کی تصویر کو دیوار سے اتار کے پھر اسے سیدھا ٹنگا دیا اجنبی پھر اسے الٹی کرنے جا رہا تھا کہ سرلکھ سنگھ نے گرج کے کہا۔

"تصویر کو الٹا کیا تو جان سے ماردوں گا۔"

اجنبی کانپنے لگا۔

ڈی میلو نے سرمکھ سے کہا۔

"تم کھائی پیلی بوم مارتا ہے — یہ ٹیبل اس کا ہے، یہ چھاتا اس کا ہے، یہ ٹوپی اس کا ہے۔ یہ سامنے کا دیوار اس کا ہے وہ اس پر مس کجن کا فوٹو رکھے گا۔ اپنے باپ کا — رکھے گا۔ الٹا رکھے گا۔ سیدھا رکھے گا۔ ام کو کیا ہے۔ تم سرمکھ سنگھ کیوں نفڑا کرتا ہے —!"

"نہیں ہم عورت کی بے عزتی نہیں برداشت کرے گا۔ ہم اس تصویر کو سیدھا رکھے گا۔"

سرمکھ سنگھ نے میز پر گھونسا مار کے کہا۔

"ہم الٹا رکھے گا۔"

اجنبی نے بہت ملائمت سے کہا۔

"ہم سیدھا رکھے گا۔"

"ہم الٹا ....."

اجنبی نے اپنا قہقہہ پورا نہیں کیا اس نے جلدی جلدی سے اپنے گلاس میں دو پیگ یکے بعد دیگرے انڈیلے اور پی گیا۔ پھر میز پر آگے جھک کے بولا

"سنو۔ ہم تمہیں ایک بات بتاتے ہیں اس کے بعد تم خود فیصلہ کرو کہ اس فوٹو کو یہاں سیدھا لٹکنا چاہیئے کہ الٹا۔"

اس نے جام کو اپنے ہاتھوں میں گھمایا اس کی آنکھیں خوابیدہ ہوگئیں دھند

چاروں طرف گہری ہو گئی۔

"آج سے آٹھ سال پہلے کا ذکر ہے"
اجنبی نے داستان کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔
"میں شولاپور میں جھگن بھائی کی مل میں فورمین تھا۔ تنخواہ ٹھیک تھی۔ مالک بھی ٹھیک تھے میں کسی اسٹرائیک کے جھگڑے میں پڑتا نہیں تھا اس لئے بڑے مزے میں گزر ہوتی تھی۔ نہ کسی کا لینا نہ دینا — بس اپنے کام سے کام۔ دنیا جائے چولہے میں — اپنے کو کیا ہے چھوٹا سا گھر ہے جسے ایک پیاری پیاری بیوی نے سجا رکھا ہے۔

میری بیوی بہت اچھی تھی — خوب صورت، خوب سیرت، سگھڑ اور رکھ رکھاؤ والی۔ جب دیکھو صاف ستھرے کپڑے پہنے ایک گڑیا سی نظر آتی ہمارا گھر بہت چھوٹا تھا بس ایک کمرہ تھا جس کے ایک کونے میں مل تھا لیکن میری بیوی نے اس ایک کمرے کو یوں سجا رکھا تھا کہ اگر تم دیکھتے تو حیران رہ جاتے — کبھی کبھی جب مگن لال ہمارے ہاں آتا....."
"مگن لال کون ہے۔؟"
نواز نے پوچھا
"میرا دوست ہے —" اجنبی نے کہا۔ منڈیوں کا دلال ہے"
"تمہاری اس کی دوستی کیسے ہوئی؟"
سر سکھ نے پوچھا۔

"ایک دفعہ مجھے اپنی بیوی کی علالت کے سلسلے میں چار سو روپے کی ضرورت پڑی تھی۔ تو مگن لال کی وساطت سے ہنڈی پر روپیہ ملا تھا۔ جب سے یہ جان پہچان ہوئی تھی جو بعد میں بڑھتے بڑھتے گہری دوستی کی حد تک پہنچ گئی۔ لیکن یہ بعد کی بات ہے۔ ان دنوں جب کا میں ذکر کر رہا ہوں ایسی گہری دوستی نہیں تھی۔ پھر بھی مگن لال کبھی کبھار ہمارے گھر آتا تھا اور جب بھی وہ آتا تو میری بیوی کے سلیقے کو دیکھ کر حیرت میں رہ جاتا کہتا۔

اس گھر کی سجاوٹ اور قرینے کو دیکھ کے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم دونوں کی شادی آج ہی ہوئی ہے اور سچ مچ میں اور میری بیوی ایک دوسرے سے ایسی ہی محبت کرتے تھے۔ جیسے ہماری شادی کو چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں گزرا۔

اجینی چپ ہو گیا ـــــ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

چند لمحوں کے بعد اس نے بوتل میں سے رم گلاس میں انڈیلی۔ جام کو اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھا کے گھمانے لگا۔ جام کو اپنی آنکھوں کے سامنے لایا اس کے ماتھے کی شکنیں گہری ہو گئیں

"پھر کیا ہوا۔"

ڈی میلو نے پوچھا

"ٹھہرو ـــــ" اجینی نے کہا۔ "وہ میری زندگی کے بہترین ایام تھے میں ان دنوں کی یاد میں ہر روز ایک ٹوسٹ پیتا ہوں۔ آج تم بھی پیو۔"

اجینی نے اپنا گلاس بڑھایا۔ اس کے تینوں ساتھیوں نے اس کے گلاس سے اپنے گلاس ٹکرائے اور پھر پی گئے۔ اجینی نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر

کے کہا۔"

"اس کے بعد یہ آج سے پانچ سال پہلے کا ذکر ہے۔ تمہیں یاد ہوگا۔ بمبئی پونا اور احمد آباد میں کتنی زور کی پلیگ پھیلی تھی۔"

"ہاں یاد ہے ——"

ڈی میلو نے افسردگی سے کہا۔" میرا بڑا بھائی اسی پلیگ میں مرا تھا۔"

"اسی پلیگ کا ذکر ہے —— یہ پلیگ شولاپور میں بھی پھیلی —— شہر خالی ہونے لگا۔ کارخانہ بند ہوگیا۔ سڑکوں پر گلی کوچوں میں لاشیں دکھائی دینے لگیں میری بیوی تو ڈر کے مارے گھر سے باہر نہ نکلتی تھی لیکن مجھے تو سودا سلف لینے اور ادھر ادھر کا کام کرنے کے لئے گھر سے باہر جانا پڑتا تھا ہاں بیوی کا باہر نکلنا میں نے بند کردیا تھا۔ کیونکہ یہ چھوت کی بیماری ہوتی ہے اور کون جانے کیا ہوجائے۔ اور میری بیوی مجھے بہت پیاری تھی۔

ایک دن رات کو مجھے ہلکا سا بخار ہوا۔ کندھے میں درد ہونے لگا۔ پھر گلٹی نکل آئی۔ میں بخار میں پھنکنے لگا۔ بیوی میری طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا

"گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بھاگ کے کسی ڈاکٹر کو بلا لاؤ"

بیوی میری طرف اسی طرح پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔

میں نے ذرا غصے سے کہا۔

"کیا دیکھ رہی ہو —— جلدی سے نکڑ والے ڈاکٹر کا مٹھ کو بلا لاؤ۔ نہ آئے تو نقد فیس ساتھ لے جاؤ ——"

میری بیوی نے اپنا ٹرنک کھولا جس میں وہ نقدی رکھتی تھی دیر تک وہ صندوق میں اتھل پتھل کرتی رہی۔ مجھے بہت ناگوار گزرا۔

میں نے کہا۔

"کیا کر رہی ہو ـــــ یہاں جان پر بنی ہے۔ تم ابھی تک صندوق ہی کھولے بیٹھی ہوئی ہو۔"

"کیا کروں ـــ باہر جانا ہے تو ان ہی کپڑوں میں نہیں جا سکتی۔"

میری بیوی نے پوشاک بدلی تھوڑی دیر تک صندوق اور اتھل پتھل کرتی رہی اور پھر جلدی سے باہر نکل گئی۔ جاتے جاتے میں نے اس سے کہا۔

"جلدی سے ڈاکٹر کو لے آؤ۔"

آدھا گھنٹہ گزرا ـــــ میری بیوی ڈاکٹر کو لے کے نہ آئی۔ ان دنوں ڈاکٹروں پر بھی مصیبت تھی۔ کہاں کہاں جاتے ـــــ، کس کس کو سنبھالتے جانے ڈاکٹر کا مغز اس وقت کہاں ہوگا۔"

میں نے اپنے آپ سے پوچھا

ایک گھنٹہ اور گزر گیا ـــــ مجھ پر ہذیانی کیفیت طاری ہونے لگی۔ پھر مجھے معلوم نہیں کیا ہوا ـــ میں بے ہوش ہو گیا جب ہوش میں آیا تو دیکھا کمرے کا بلب روشن ہے اور میرے چہرے کے سامنے دو چہرے دھندلا رہے ہیں روشن ہو جاتے ہیں۔ دھندلا جاتے ہیں۔ میں نے نحیف آواز میں کہا۔

"منور ما ـــــ پانی دو۔"

ڈاکٹر نے مجھے پانی پلایا۔

مگن لال نے ڈاکٹر کے کان میں کچھ کہا۔ میں نے نہیں سنا۔ اس نے کیا کہا۔

عین اس وقت میرے کان میں بہت شور و غوغا ہو رہا تھا بہت سے چوہے ہنس رہے تھے۔ لمبے لمبے دانتوں والے راکشش قہقہے لگا رہے تھے آگ کے شعلے اپنی لمبی لمبی زبانیں نکالے میرے جسم کو چاٹ رہے تھے۔ میں ایک چیخ مار کے پھر بے ہوش ہو گیا۔

مجھے معلوم نہیں میں کتنے دن بے ہوش رہا۔ کتنے دن اسی طرح موت اور زندگی کے درمیان لٹکتا رہا۔ لیکن آخر زندگی کی فتح ہوئی۔ موت کی فتح ہوتی تو بھی مجھے کیا غم ہوتا اور بھی تو ہزار ہا تھے جو میری طرح مر گئے۔ میں بھی مر جاتا تو کیا بُرا تھا۔

بہر حال میں بچ گیا۔ مگن لال کی شب و روز کی تیمارداری اس کی انتھک محنت اس کے خلوص کی گہری قوت نے میری زندگی بچا لی۔ جس طرح اس نے اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے میرے لئے دن رات ایک کر دیئے ایسے شائد کوئی سگی ماں بھی اپنے بیٹے کے لئے نہ کر سکے۔ میں حیران ہوں دنیا میں ایسے بھی نیک آدمی ہیں آدمی نہیں فرشتے ـــــ مگن لال نے سات آٹھ دن ایک پلک نہ جھپکائی۔

"اور تمھاری بیوی ـــــ؟"

ڈی میلو نے پوچھا

"وہ تو پہلے ہی دن بھاگ گئی تھی ـــــ صندوق سے نقدی اور زیور لے کر فرار ہو گئی تھی ـــــ"

"وہ تو ڈاکٹر کو بلانے گئی تھی نا؟"

"ہاں ـــــ لیکن پھر واپس نہیں آئی۔"

اجنبی غور سے اپنے گلاس کی طرف دیکھنے لگا۔

تھوڑی دیر سناٹا رہا۔ اس سناٹے میں دوسری میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کی آوازیں یکایک بہت عجیب اور کسی دوسری دنیا سے آتی ہیں معلوم ہوئیں "دو کباب" ایک اکشا نمبر دن، سوس آدھا۔ جانی میں تیرا غلام ہوں۔ تھوک میرے سر پر۔ اس وقت کیا بجا ہے ـــــ؟

جلدی سے تین پیگ اور منگالو ـــــ یہ انڈہ گندہ ہے۔ میں نے سالے کو وہ چھا پڑ دیا کہ دن میں تارے ہی نظر آگئے ہوں گے۔ ہاں یار بڑی چلتی ہوئی لونڈیا ہے۔

وائیلنانہ ڈی سیلو کو معلوم ہوا جیسے یہ اس دنیا کی آوازیں نہیں ہیں وہ کہیں شولاپور میں بیٹھے ہیں ایک چھوٹا سا کمرہ ہے۔ ایک عورت چور نظروں سے اپنے بیمار خاوند کو تاکتی ہوئی اپنی ساڑھی میں زیور اڑستی ہوئی بھاگ رہی ہے اجنبی پلینگ سے کراہ رہا ہے باہر ایک چتا جل رہی ہے دل کے اندر بھی ایک چتا جل رہی ہے۔ یہ پانی نہیں ہے الکوحل ہے یہ آگ بجھاتی نہیں ہے۔ لگاتی ہے۔

اجنبی نے اپنا پیگ خالی کر کے کہا۔

" پھر پلینگ دب گئی۔ پھر میں نے شولاپور چھوڑ دیا اور یہاں آگیا اور

کوہ نور مل میں نوکری کر لی۔ میرے ساتھ میرا دوست مگن لال بھی آ گیا۔ ہم دونوں ساتھ رہنے لگے۔

اور یہ ایک بالکل قدرتی بات تھی کہ وہ میرے ساتھ رہے کیونکہ دنیا میں میرے سوا اس کا کوئی نہیں ہے وہ یہاں آ کے کس کے ساتھ رہتا۔ اس نے میری جان بچائی۔ کیا میں اتنا ناشکرا ہو سکتا ہوں۔

اب وہ پریل میں میرے گھر میں رہتا ہے میرا گھر اسی طرح شوالا پور کے گھر کی طرح ہے اب وہ پھر اسی طرح سج گیا ہے بن سنور گیا ہے۔ میرے گھر میں پھر ایک بیوی ہے۔ خوبصورت، خوب سیرت، سگھڑ سلیقے والی پہلی بیوی سے بھی اچھی۔ جب میں اسے بیاہ کے لایا تھا تو ساری بلڈنگ ایک دم چوکنی ہو گئی تھی جیسے کسی کی نگاہیں یک لخت خیرہ ہو جائیں۔

ایسا حسن تھا۔ میری بیوی کا ـــــ مگن لال کو بھی میری بیوی بہت پسند آئی آہستہ آہستہ میری بیوی کو بھی مگن لال پسند آنے لگا۔ آہستہ آہستہ میں ان دونوں کی نظریں دیکھنے لگا۔ آہستہ آہستہ میں ان دونوں کے ہاتھوں کی انگلیوں کی تھرتھراہٹ سے واقف ہوتا گیا جب نظریں ملتیں یا جب نگاہیں ملتیں یا جب وہ میری غیر حاضری میں کبھی چوری سے ملتے اور میں عین موقع پر آ جاتا تو ان دونوں کو ایسا معلوم ہوتا۔ وہ ایسے ناٹے میں چپ سے رہ جاتے کہ تم جانتے ہو نا؟

محبت جب چپ ہوتی ہے تو کس قدر گویا ہوتی ہے اس کی خاموشی میں کس قدر شدت ہے مجھے ایسا معلوم ہونے لگا۔ جیسے میں اپنے گھر میں اجنبی

ہوں اس طرح ان کے فریادی چہرے، ان کی پریشان نگاہیں اُن کے اڑتے اڑتے، رکتے رکتے احساس ـــــ تم جانتے ہو نا؟ اور نہیں جانتے ہو تو میں تو جانتا ہوں۔ کیونکہ جس آدمی نے محبت کو ایک مرتبہ دیکھا ہو وہ اسے ہمیشہ دیکھ سکتا ہے کیونکہ محبت کے الفاظ نہیں ہوتے۔ اس کی ایک خوشبو ہوتی ہے ایک احساس ہوتا ہے۔ ایک تھرتھری ہوتی ہے ایک جذبہ سیدھا ہوتا ہے ایک تصویر الٹی ہوتی ہے؛

اجنبی نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پیگ انڈیلا۔

"آہستہ آہستہ میں کمرے کے باہر کی بالکونی میں سونے لگا۔ وہ دونوں اندر سونے لگے آہستہ آہستہ مجھے معلوم ہوا کہ جب میں مل سے اپنی بلڈنگ میں واپس آتا ہوں تو ساری بلڈنگ مجھے چوکنا ہو کے دیکھتی ہے۔ جیسے میں انسان نہیں ہوں۔ کوئی عجیب سا جانور ہوں۔ جب میں گھر سے باہر نکلتا ہوں تو اسی طرح وسوسوں اور شبہوں کے درمیان میں گھرے ہوئے لوگ مجھے دیکھتے ہیں۔ کبھی کبھی رات پالی ہوتی ہے۔ اور مل میں کام زیادہ ہوتا ہے اور مل کے مالک مجھے بلا لیتے ہیں تو میں اپنی بلڈنگ کی سیڑھیوں پر لوگوں کو کھسر پھسر کرتے دیکھتا ہوں ـــــ سن نہیں سکتا ہوں۔ لیکن سمجھ سکتا ہوں۔ وہ کیا کہہ رہے ہیں ـــــ وہ بھی سمجھ رہے ہیں۔ کہ جارہا ہے کمبخت اپنی بیوی کا بھاڑہ جارہا ہے۔ کمزور، بزدل، نامرد جارہا ہے۔ آج رات پالی کو جارہا ہے۔ اور آج اس کی بیوی اور اس کے دوست کی چاندی ہے اور عیش ہے۔ اور مرادوں بھری رات ہے۔ اور تاروں بھرے نیچے میں ہیں اور

اور پھر کوئی زینے کے اوپر سے ہنس دیتا ہے اور میں جلدی جلدی سیڑھیاں اتر کر بلڈنگ سے باہر نکل جاتا ہوں۔ اور پھر کام ختم کرنے پر یہاں آتا ہوں اور سیدھا اس شراب خانے میں آتا ہوں یہ میز میرے لئے ہمیشہ ریزرو رہتی ہے یہ میز، یہ بوتل رم کی دو کیتے والی رم۔ پانچ سال سے میں یہاں آرہا ہوں۔ ستواتر آرہا ہوں میں ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر سکا کہ کس کا گلا گھونٹوں اپنی۔ بیوی کا جس سے میں محبت کرتا ہوں یا اپنے دوست کا جس نے میری جان بچائی تھی۔ اپنی بیوی کا یا اپنے دوست کا۔ اپنی بیوی کا اپنے دوست کا !!

اس کی آواز بلند ہوتی گئی اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ اس زور سے اپنے جام کو ہتھیلیوں میں دبایا کہ گلاس اس کے ہاتھوں میں چکنا چور ہو گیا اور اس کے ہاتھوں سے خون بہنے لگا۔

خون اس کے ہاتھوں سے بہہ بہہ کر سنگِ مرمر کی میز پر گر رہا تھا۔ سنگِ مرمر کی سطح پر ایک لمبی دراز تھی خون اس دراز میں غائب ہوتا جارہا تھا اجنبی اس طرح اس بہتے ہوئے خون کو دیکھ رہا تھا جیسے یہ اس کا خون نہ ہو کسی دوسرے کا خون ہو۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ اُٹھا اور نل سے ہاتھ دھو کے اور رومال باندھ کے واپس آگیا واپس آکے اس نے اپنے سر پر ٹوپی رکھی چھتری اٹھائی دیوار پر لٹکی ہوئی مس کجن کی تصویر کو الٹا کر دیا پھر اس نے جھک کر ان تینوں کو سلام کیا اور شراب خانے سے باہر نکل گیا۔

بار بند ہونے میں پندرہ منٹ باقی رہ گئے تھے۔
بیرے نے ان تینوں دوستوں کے لئے آخری پیک للکے رکھے۔
آج وہ اپنے ساز بجانے کی ساری اجرت شراب میں گھول کے پی گئے تھے
آج وہ تینوں جھوم رہے تھے۔
"سالا —" سرنکھ بولا — "سالا نامرد ہوگا۔ جبھی تو پہلی بیوی بھاگ گئی اور دوسری بیوی نے دوسرے کے ساتھ آشنائی کرلی۔
"کمبخت حرامی —" نواز بولا "دنیا سے الگ تھلگ رہتا تھا اب دنیا اس پر ہنسے گی نہیں تو کیا کرے گی —"
سرنکھ کی نظریں سامنے دیوار پر گڑ گئیں۔ جہاں لچھن کی تصویر الٹی لٹک رہی تھی۔
سرنکھ نے کرسی سے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "سالا عورت کی تصویر پھر الٹی کر گیا — کیا سمجھتا ہے ایک عورت کی تصویر الٹی کرکے عورت ذات سے انتقام لے رہا ہے۔ ٹھہرو — میں ابھی اس الٹی تصویر کو سیدھا کرتا ہوں"
ڈی میلو کا چہرہ اس وقت بہت اداس اور بوڑھا دکھائی دے رہا تھا ایک ایسا چہرہ جس میں صدیوں کی اداسی کے ساتھ صدیوں کی دانشمندی بھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے سرنکھ کا بازو پکڑ کر واپس کرسی پر بٹھا دیا اور کہنے لگا۔
"میری جان! یہ تصویر الٹی نہیں ہے سارا نظام زندگی الٹا ہے ایک تصویر کو سیدھا کرنے سے کیا ہوگا۔"

"پھر کیا کروں؟" سُر لکھ نے حیرت سے پوچھا

"میں خود نہیں جانتا۔ میں ایک وائیلن بجانے والا ہوں" بوڑھے ڈی میلو نے وائیلن کو ٹھوڑی کے نیچے رکھا اور آہستہ آہستہ وائیلن بجانے لگا۔ آہستہ آہستہ اس کی خمار آلود نگاہوں میں ایک موسیقی پیدا ہوتی گئی۔ وہ ناقابل بیان آہستہ خرام حسین موسیقی اپنے جلو میں کائنات کے سارے غم و سارے سکون سمیٹے ہوئے انگڑائیاں لیتے ہوئے آئی اور اس کے ریشمی سروں کا بلبوس پانی کی مدھم لہروں کی طرح مچلتا ہوا ان کے احساسات پر چھا تا گیا اور ساری فضا میں شفاف اور بلوریں گھنٹیوں کے چھلکتے ہوئے سُر مقطر شراب کی بوندوں کی طرح ٹپکنے لگے۔

ایرانی پلاؤ

آج رات اپنی تھی۔ کیونکہ جیب میں پیسے نہیں تھے جب جیب میں تھوڑے سے پیسے ہوں تو رات مجھے اپنی معلوم نہیں ہوتی اس وقت رات میرین ڈرائیو پر تھرکنے والی گاڑیوں کی معلوم ہوتی ہے جگمگاتے ہوئے فلیٹوں کی معلوم ہوتی ہے ایمبیسیڈر ہوٹل کی چھت پر ناچنے والوں کی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن آج رات بالکل اپنی تھی آج رات آسمان کے سارے ستارے اپنے تھے اور بمبئی کی ساری سڑکیں اپنی تھیں جب جیب میں تھوڑے سے پیسے ہوں تو سارا شہر اپنے پر مسلط ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ہر شے گھورتی ہے ڈانٹتی ہے اپنے آپ سے دور بیٹھنے پر مجبور کرتی ہے اونی پتلون سے لے کر خوش نما ریڈیو گرام تک ہر چیز کہتی ہے مجھ سے دور رہو لیکن جب جیب میں ایک پائی نہ ہو اس وقت سارا شہر اپنے لئے بنا ہوا معلوم ہوتا ہے اس کے ہر پتھر پر، گلی کے موڑ پر، بجلی کے ہر کھمبے پر گویا یہ لکھا ہوتا ہے " تعمیر کیا گیا برائے بشن ایک فاقہ مست مصنف " اس دن نہ حوالات کا ڈر ہوتا ہے نہ گاڑی کے پیٹ میں آجانے کا۔ نہ ہوٹل میں کھانے کا

ایک ایسی وسیع بے فکری اور بے کنار فاقہ مستی کا نشہ آور موڈ ہوتا ہے جو میلوں تک پھیلتا چلا جاتا ہے اس رات میں خود نہیں چلتا ہوں اس رات بمبئی کی سڑکیں مجھے اٹھائے اٹھائے چلتی ہیں اور گلیوں کے موڑ اور بازاروں کے نکڑ اور بڑی بڑی عمارتوں کے تاریک کونے مجھے خود دعوت دیتے ہیں۔ ادھر آؤ ہمیں بھی دیکھو۔ ہم سے ملو۔ دوست تم آٹھ سال سے اس شہر میں رہتے ہو لیکن پھر بھی اجنبیوں کی طرح کیوں چل رہے ہو ادھر آؤ ہم سے ہاتھ ملاؤ۔

آج رات اپنی تھی آج رات کسی کا ڈر نہیں تھا۔ ڈر اسے ہوتا ہے جس کی جیب بھاری ہوتی ہے اس خالی جیبوں والے ملک میں بھاری جیب والوں کو ڈر ہونا ہی چاہیئے لیکن اپنے پاس کیا تھا جسے کوئی چھین سکتا۔

سنا ہے حکومت نے ایک قانون بنا رکھا ہے جس کی رو سے رات کے بارہ بجے کے بعد سڑکوں پر گھومنا منع ہے کیوں کیا بات ہے۔ رات کے بارہ بجے کے بعد بمبئی میں کیا ہوتا ہے جسے وہ مجھ سے چھپانا چاہتے ہیں۔ میں تو ضرور دیکھوں گا چاہے کچھ بھی ہو جائے آج تو میں ضرور گھوموں گا اور اپنے دوستوں سے ہاتھ ملاؤں گا۔

یہی سوچ کر میں چرچ گیٹ ری کلے میشن کے سامنے کی سڑک سے گزر کر نیو پیٹی گراؤنڈ میں گھس گیا ارادہ تو یہ تھا کہ میدان کے بیچ میں سے گزر کر دوسری طرف بڑے تار گھر کے سامنے جا نکلوں گا۔ اور وہاں سے فلورا فاؤنٹین چلا جاؤں گا مگر میدان سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ ایک کونے میں چند لڑکے دائرہ بنائے بیٹھے ہیں اور تالی بجا بجا کر گا رہے ہیں۔

تیرا میرا پیار ہو گیا!

تیرا میرا
میرا تیرا
تیرا میرا پیار ہوگیا۔

دو تین لڑکے تالی بجا رہے تھے ایک لڑکا منہ سے بانسری کی آواز نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک لڑکا سر ہلاتے ہوئے ایک ٹکڑی کے بکس سے طبلے کے بول نکال رہا تھا۔ سب خوشی میں جھوم رہے تھے اور موٹی پتلی اونچی نیچی آوازوں میں گا رہے تھے۔ میں نے قریب جا کر ان سے پوچھا۔ "کیوں بھئی کس کا ــــ کس سے پیار ہوگیا۔

وہ لوگ گانا بند کر کے ایک لمحے کے لئے مجھے دیکھنے میں مصروف ہوگئے۔ پتہ نہیں لوگوں کو دیکھنے میں کیسا لگتا ہوں میں ــــ لیکن اتنا مجھے معلوم ہے کہ ایک لمحہ دیکھنے کے بعد لوگ بہت جلد مجھ سے گھل مل جاتے ہیں۔ مجھ سے ایسے مانوس ہو جاتے ہیں کہ زندگی بھر کے راز اور اپنی مختصر سی کائنات کی ساری تصویریں اور اپنے دل کے سارے دکھ درد مجھ سے کہنے لگ جاتے ہیں میرے چہرے پر کوئی بڑائی نہیں کوئی خاص اچنبھے کی بات نہیں۔ کوئی رعب اور دبدبہ نہیں میرے لباس میں بھی کوئی خاص شوکت نہیں، وہ طنطنہ نہیں جو کالی اچکن اور سرخ گلاب کے پھول میں ہوتا ہے یا شارک اسکن کے سوٹ میں ہوتا ہے بس پاؤں میں معمولی چپل ہے اس کے اوپر لٹھے کا پاجامہ اور اس کے اوپر لٹھے کی قمیض ہے جو اکثر پیٹھ پر سے میلی رہتی ہے۔ کیونکہ ایک تو مجھے اپنے جھونپڑے میں زمین پر سونے کی عادت ہے۔ دوسرے مجھ میں یہ بھی بری عادت ہے کہ جہاں پر بیٹھتا ہوں اکثر دیوار سے پیٹھ لگا کے بیٹھتا ہوں، یہ الگ بات

ہے۔ میری زندگی میں میلی دیواریں زیادہ آتی ہیں اور اجلی دیواریں بہت کم۔ قمیض کی بخت کندھوں سے بہت جلد جاتی ہے اور وہاں اکثر آپ کو ٹانکے دکھائی دیتے ہیں کیونکہ ٹانکے پھٹے ہوئے کپڑے کے دو کناروں کو جوڑنے کا نام ہے پھٹے پرانے کپڑے کو جوڑنے کی بار بار کوشش کی جاتی ہے کیونکہ ہر آدمی کالی اچکن پر سرخ گلاب کا پھول نہیں ٹانک سکتا۔ اس ٹانکے اور اس ٹانکے میں اس قدر فرق کیوں ہے۔

یہ سچ ہے کہ دو انسان ایک جیسے نہیں ہوتے ایک شکل و صورت کے نہیں ہوتے ہیں بمبئی میں شب و روز مختلف چہرے دیکھتا ہوں۔ لاکھوں مختلف چہرے لیکن یہ کیا بات ہے کہ ان سب کے کندھوں پر وہی ٹانکے لگے ہوتے ہیں لاکھوں ٹانکے پھٹی ہوئی زندگیوں کے کناروں کو ملانے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ ایک نقاد نے میرے افسانے پڑھ کر مجھ سے کہا تھا۔ کہ مجھے ان میں کسی انسان کا چہرہ نظر نہیں آتا یہی مجھ میں مصیبت ہے کہ میں اپنے کرداروں کے چہرے نہیں بیان کرتا۔ ان کے کندھوں کے ٹانکے دیکھتا ہوں۔ ٹانکے مجھے انسان کا اندرونی چہرہ دکھاتے ہیں اس کی دن رات کی کشمکش اور اس کی شب و روز محنت کا سراغ بتاتے ہیں جس کے بغیر زندگی کا کوئی ناول اور سماج کا کوئی افسانہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس بات کی مجھے خوشی ہے کہ میرا چہرہ دیکھ کر کوئی مجھے کلرک سمجھتا ہے کوئی کباڑیا کوئی کنگھی بیچنے والا یا بال کاٹنے والا۔ آج تک کسی نے مجھے وزیر یا جیب کاٹنے والا نہیں سمجھا اس بات کی مجھے خوشی ہے کہ میں ان لاکھوں کروڑوں آدمیوں میں سے ایک ہوں جو بہت جلد ایک دوسرے سے بغیر کسی رسمی تعارف کے مانوس ہو جاتے ہیں۔

یہاں بھی ایک لمحے کی جھجک کے بعد وہ لوگ میری طرف دیکھ کر مسکرائے۔

ایک لڑکے نے مجھ سے کہا۔

"آؤ بھائی تم بھی یہاں بیٹھ جاؤ اور اگر گانا چاہتے ہو تو گاؤ۔"

اتنا کہہ کر اس دبلے پتلے لڑکے نے اپنے سر کے بال جھٹک کر پیچھے کر لئے اور اپنا لکڑی کے بکس کا طبلہ بجانے لگا۔ ہم سب لوگ مل کر پھر گانے لگے۔

تیرا میرا

میرا تیرا

پیار ہو گیا!

یکایک اس دبلے پتلے لڑکے نے طبلہ بجانا بند کر دیا اور اپنے ایک ساتھی کو جو اپنی گردن دونوں ٹانگوں میں دبائے اکڑوں بیٹھا تھا ٹہوکا سا دے کر کہا۔

"ابے مدھو بالا تو کیوں نہیں گاتا۔"

مدھو بالا نے اپنا چہرہ ٹانگوں میں سے بڑی دقت سے نکالا اس کا چہرہ مدھو بالا ایکٹرس کی طرح حسین نہیں تھا۔ ٹھوڑی سے لے کر دائیں ہاتھ کی کہنی تک آگ سے جلنے کا ایک بہت بڑا نشان یہاں سے وہاں تک چلا گیا تھا۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں تھے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں جو اس کے گول چہرے پر دو کالی کالی درزیں معلوم ہوتی تھیں انتہائی پریشانی جھلک رہی تھی اس نے اپنے ہونٹ سیکڑ کے طبلے والے سے کہا۔ "سالے مجھے رہنے دے میرے پیٹ میں درد ہوتا ہے۔

"کیوں درد ہوتا ہے! سالے تو نے آج پھر ایرانی پلاؤ کھایا ہوگا۔"

مدھو بالا نے بڑے دکھ سے سر ہلایا "ہاں وہی کھایا تھا۔

"کیوں کھایا تھا سالے"

"کیا کرتا آج صرف تین جوتے پالش کئے تھے۔"

ایک اور لڑکے نے جو عمر میں ان سب سے بڑا معلوم ہوتا تھا جس کی ٹھوڑی پر تھوڑی ڈاڑھی اُگی تھی۔ اور کنپٹیوں کے بال رخساروں کی طرف بڑھ رہے تھے اپنی ناک کھجاتے ہوئے کہا۔ "ابے مدھو بالا اٹھ میدان میں دوڑ لگا چل میں تیرے ساتھ دوڑتا ہوں دو چکر لگانے سے پیٹ کا درد ٹھیک ہو جائے گا۔"

"نہیں بے رہنے دے۔

"نہیں بے سالے اٹھ نہیں تو ایک جھانپڑ مار دوں گا۔"

مدھو بالا نے ہاتھ جوڑ کے کہا —— "ککو رہنے دے۔ میں تیری منت کرتا ہوں۔ یہ پیٹ کا درد ٹھیک ہے"

اٹھ بے کیوں ہماری سنگت خراب کرتا ہے"

ککو نے ہاتھ بڑھا کر مدھو بالا کو اٹھایا اور وہ دونوں یونیورسٹی گراؤنڈ میں چکر لگانے لگے۔ "پہلے تو میں تھوڑی دیر تک ان دوڑتے ہوئے لڑکوں کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر جب میرے قریب بیٹھے ہوئے لڑکے نے سر کھجا کے کہا۔ "سالی کیا مصیبت ہے۔ ایرانی پلاؤ کھاؤ تو مصیبت ہے نہ کھاؤ تو مصیبت ہے۔"

میں نے کہا۔ بھائی پلاؤ تو بڑے مزے کی چیز ہے اسے کھانے سے پیٹ میں درد کیسے ہو سکتا ہے۔" میری بات سن کے وہ سب ہنسے ایک لڑکے نے جس کا نام بعد میں مجھے کلدیپ کور معلوم ہوا اور جو اس وقت ایک پھٹی ہوئی بنڈی اور ایک پھٹی ہوئی نیکر پہنے تھا۔ مجھ سے ہنس کر کہا۔ معلوم ہوتا ہے تم نے ایرانی پلاؤ کبھی

نہیں کھایا۔

کلیپ کور نے اپنی بنڈی کے بٹن کھولتے ہوئے مجھے بتایا کہ ایرانی پلاؤ ان لوگوں کی خاص اصطلاح ہے اسے یہ لوگ روز روز نہیں کھاتے لیکن جس دن جس لڑکے نے جوتے بہت کم پالش کئے ہوتے ہیں یا جس دن اس کے پاس بہت کم پیسے ہوتے ہیں اس دن اسے ایرانی پلاؤ کھانا ہی پڑتا ہے اور یہ پلاؤ سامنے کے ایرانی ریستوران سے رات کے بارہ بجے کے بعد ملتا ہے جب سب گاہک کھانا کھا کے چلے جاتے ہیں دن بھر میں جو لوگ ڈبل روٹی کے ٹکڑے اپنی پلیٹوں میں چھوڑ جاتے ہیں ڈبل روٹی کے ٹکڑے گوشت اور ہڈیاں بچھوڑی ہوئی۔ چاولوں کے دانے آملیٹ کے ریزے آئوں کے قتلے یہ سارا جھوٹا کھانا ایک جگہ جمع کر لیا جاتا ہے اور اس کا ایک ملغوبہ تیار کر لیا جاتا ہے اور یہ ملغوبہ در آنے پلیٹ کے حساب سے بکتا ہے پیچھے کچن کے دروازے پر — اسے ایرانی پلاؤ کہا جاتا ہے۔ اسے عام طور پر اس علاقے کے غریب لوگ بھی نہیں کھاتے۔ پھر بھی ہر روز دو تین سو پلیٹیں بک ہی جاتی ہیں۔ خریداروں میں زیادہ تر جوتے پالش کرنے والے، فرنیچر ڈھونے والے، گاہکوں کے لئے ٹیکسی لانے والے ہوتے ہیں یا اس پاس کی بلڈنگوں کے بیکار نوکر یا زیر تعمیر بلڈنگوں میں کام کرنے والے مزدور بھی ہوتے ہیں۔

میں نے کلیپ کور سے پوچھا — "تمہارا نام کلیپ کور کیوں ہے" کلیپ کور نے اپنی بنڈی بالکل اتار دی اور اب وہ بڑے مزے سے لیٹا ہوا اپنا سیاہ پیٹ سہلا رہا تھا۔ وہ میرا سوال سن کر وہیں گھاس پر لوٹ پوٹ ہو گیا پھر ہنس چکنے کے بعد اپنے ایک ساتھی سے کہنے لگا۔ "ذرا میرا بکسا لانا — ساتھی نے کلیپ کور کا بکسا لا کر

دیا۔ کلدیپ کور نے بکسا کھولا اس بکس میں پالش کی جتنی چھوٹی بڑی ڈبیاں تھیں ان پر نرگس کی تصویریں تھیں جو رسالوں اور اخباروں کے صفحے سے کاٹ کر لگائی گئی تھیں۔

کلدیپ کور نے کہا۔ یہ سالا نرگس پالش مارتا ہے۔ وہ نمی کا وہ ثریا کا۔ ہم میں سے جتنا پالش والا ہے کسی نہ کسی فلم ایکٹریس کی تصویر کاٹ کر اپنے ڈبوں پر لگاتا ہے۔ اور اس کا پالش مارتا ہے۔

"کیوں؟

سالا گاہک ان باتوں سے بہت خوش ہوتا ہے۔ ام اس سے بولتا ہے صاحب کون سا پالش لگاؤں، نرگس کہ ثریا کہ مدھوبالا ـــــ پھر جو گاہک جس فلم ایکٹریس کو پسند کرتا ہے اس کا پالش مانگتا ہے تو ہم اس کو اس لڑکے کے حوالے کر دیتا ہے جو نرگس کا پالش یا نمی کا یا کسی دوسری فلم ایکٹریس کا پالش مارتا ہے ہم آٹھ لڑکے ہیں۔ ادھر سامنے چرچ گیٹ پر اسی بس اسٹینڈ کے نیچے بیٹھتے ہیں جو جس کے پاس جس ایکٹریس کا پالش ہے وہی اس کا نام ہے اس سے ہمارا دھندہ بہت اچھا چلتا ہے۔ اور کام کرنے میں بھی مجا آتا ہے۔

میں نے کہا۔ "تم ادھر بس اسٹینڈ کے نیچے فٹ پاتھ پر ایرانی ریستوران کے سامنے بیٹھتے ہو تو پولیس والا کچھ نہیں کہتا۔

کلدیپ کور ادھے منہ لیٹا ہوا تھا اب سیدھا ہو گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ کے انگوٹھے کو ایک انگلی سے دبا کے اسے یکایک ایک جھٹکے سے یوں نچایا جیسے وہ فضا میں اکنی اچھال رہا ہو۔ بولا ـــــ "وہ سالا کیا کہے گا۔ اسے دیتا ہے۔ اور

یہاں اس میدان میں جو سوتا ہے اس کا بھی پیسہ دیتا ہے پیسہ ! اتنا کہہ کے کلدیپ کور نے پھر انگوٹھے سے ایک خیالی اٹھنی ہوا میں اچھالی اور فضا میں دیکھنے لگا اور پھر دونوں ہاتھ کھول کر اس نے اس اٹھنی کو دبوچ لیا پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو کھول کر دیکھا ـــــ مگر دونوں ہاتھ خالی تھے۔ کلدیپ کور بڑی مزے دار تلخی سے مسکرایا اس نے کچھ نہیں کہا۔ چپ چاپ اوندھا لیٹ گیا۔

نرگس نے مجھ سے پوچھا تم ادھر ادھر میں پالش مارتے ہو نا ـــــ میں نے تم کو یزداں ہوٹل کے سامنے شائد دیکھا ہے۔

میں نے کہا۔ ہاں مجھ کو بھی ایک طرح کا پالش والا ہی سمجھو۔

ایک طرح سے کیا ـــــ؟ کلدیپ کور اٹھ کر بیٹھ گیا اس نے میری طرف گھور کر کہا۔ سالا سیدھے سیدھے بات کرو نا ـــ تم کیا کام کرتا ہے۔؟

اس نے مجھے سالا کہا۔ میں بہت خوش ہوا کوئی اور کہتا تو میں اسے ایک دیتا مگر جب اس لڑکے نے مجھے سالا کہا تو میں بہت خوش ہوا کیونکہ یہاں سالا گالی کا لفظ نہیں تھا برادری کا لفظ تھا۔ ان لوگوں نے مجھے اپنی برادری میں شامل کر لیا تھا۔ اس لئے میں نے کہا۔ " بھائی ایک طرح سے میں بھی پالش والا ہوں۔ مگر میں لفظ پالش کرتا ہوں اور کبھی کبھی چہرے اور کبھی کبھی پرانے میلے چمڑوں کو کھرچ کے دیکھتا ہوں کہ ان کی بوسیدہ تہوں میں کیا ہے۔

نرگس اور نمی ایک دم بول اٹھے۔ تو سالا پھر گڑبڑ گھوٹالا کرتا ہے صاف صاف کیوں نہیں بولتا کیا کام کرتا ہے۔

میں نے کہا۔ میرا نام بشن ہے میں کہانیاں لکھتا ہوں اخباروں میں بکتا ہوں

اوہ تو بالو ہے۔ نمی بولا نمی ایک چھوٹا سا لڑکا تھا یہاں دائرے میں جتنے لڑکے تھے ان سب سے چھوٹا تھا۔ مگر اس کی آنکھوں میں ذہانت کی تیز چمک تھی اور چونکہ وہ اخبار بھی بیچتا تھا اس لئے اسے مجھ میں بڑی دلچسپی پیدا ہوگئی اس نے میرے قریب آکر کہا۔ "کون سے اخباروں میں لکھتے ہو۔ پھری پریس۔ سنٹل ٹائمز، بمبئے کرانیکل۔ میں سب اخبار والوں کو جانتا ہوں۔

وہ بڑھ کے میرے قریب آگیا

میں نے کہا۔ میں شاہراہ میں لکھتا ہوں"

"شاہراہ؟ کون نوز پیپر ہے"

"دہلی سے نکلتا ہے"

"دلی کے چھاپے خانے سے اوہ؟ نمی کی آنکھیں چہرے پر پھیل گئیں۔ اور ادب لطیف میں لکھتا ہوں میں نے رعب ڈالنے کے لئے کہا۔

کلیپ کور ہنسنے لگا۔ کیا کہا۔ بدبے خلیطف میں لکھتا ہے۔ سالے یہ تو کسی انگلش فلم ایکٹریس کا نام معلوم ہوتا ہے بدبے خلیطف؟ آہاہا۔ ابے نمی تو اپنا نام بدل کے بدبے خلیطف رکھ لے بڑا اچھا نام، مالوم ہوگا ـــــ ہاہا۔ جب سب لڑکے ہنس چکے تو میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"بدبے خلیطف نہیں ـــــ ادب لطیف لاہور سے نکلتا ہے بہت اچھا پیپر ہے"

نرگس نے بے پرواہی سے سر ہلائے کہا۔ "ہاں سالے ہوگا ـــــ ادب لطیف ہی ہوگا۔ ہم کو کیا ہم اس کو بیچ کے ادھر پیسہ تھوڑی کماتے ہیں۔

کلیپ کور میری طرف دیکھ کر پھر ہنسنے لگا۔ ہنستے ہنستے کہنے لگا۔ مگر یار دیکھنے میں تو بالکل لکھاری معلوم نہیں ہوتا۔ بالکل ہماری طرح پالش والا معلوم ہوتا ہے۔ ہا ہا ہا ــــ

وہ پھر سب ہنسنے لگے۔ میں بھی ان کے ساتھ ہنسنے لگا۔ کر اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

کلیپ کور ہنستے ہنستے ایک دم سنجیدہ ہو گیا میری طرف دیکھ کر بولا۔ اور اس ــــ کہانی سے تم کو کیا مل جاتا ہے۔

"بس تقریباً اتنا ہی جتنا تمہیں ملتا ہے اکثر کچھ بھی نہیں ملتا۔ جب میں لفظوں پر پالش کر چکتا ہوں تو اخبار والے شکریہ کہہ کر مفت لے جاتے ہیں اور اپنے رسالے یا اخبار کو چمکا لیتے ہیں" تو خالی سغز ماری کیوں کرتا ہے۔ ہماری طرح پالش کیوں نہیں کرتا۔ سچ کہتا ہوں تو بھی آجا ہماری برادری میں، بس تیری ہی کسر تھی اور تیرا نام ہم بدبے خلیفہ رکھ دیں گے۔ لا ہاتھ ــــ"

میں نے کلیپ کور سے ہاتھ ملایا۔

کلیپ کور کہنے لگا۔ مگر چار آنے روز پولیس والے کو دینے پڑیں گے۔

"اور اگر کسی روز چار آنے نہ ہوئے تو۔"

"تو ہم کو مالوم نہیں کسی سے مانگ چوری کر ڈاکہ ڈال مگر سنتری کو چار آنے دینے پڑیں گے اور مہینے میں دو دن حوالات میں رہنا پڑے گا۔

"ارے وہ کیوں؟"

"یہ ہم نہیں جانتے سنتری کو ہم ہر روز چار آنے دیتے ہیں ہر ایک پالش والا

دیتا ہے پھر بھی سنتری ہر مہینے میں دو دفعہ ہم کو پکڑ کے لے جاتا ہے ایسا اس کا قاعدہ ہے وہ بولتا ہے ام کیا کریں۔

" میں نے کہا۔ اچھا دو دن حوالات میں بھی رہ لیں گے "

اور کلدیپ کور نے کہا۔

" تم کو مہینے میں ایک بار کورٹ میں بھی جانا پڑے گا۔ تمہارا چالان ہوگا کمیٹی کے آدمی کی طرف سے تم کو کورٹ میں حرمانہ بھی ہوگا۔ دو روپے یا تین روپے وہ بھی تم کو دینا پڑے گا۔

وہ کیوں ـــــ جب میں چار آنے سنتری کو دیتا ہوں پھر ایسا کیوں ہوگا؟

" ارے یار سنتری کو بھی تو اپنی کارگذاری دکھانی ہے کہ نہیں۔ تو سمجھتا نہیں ہے سالے بدبے خلیفت۔

میں نے آنکھ مار کے کلدیپ کور سے کہا۔

" سالے سب سمجھتا ہوں ـــــ " ہم دونوں ہنسنے لگے۔ اتنے میں مدھو بالا اور لکھو دونوں میدان کے چکر لگا کر پسینے میں ڈوبے ہوئے واپس آ گئے۔

میں نے مدھو بالا سے پوچھا

" تمہارا پیٹ کا درد غائب ہو گیا۔ "

مدھو بالا بولا ـــــ درد تو غائب ہو گیا مگر اب بھوک بڑے زور کی لگی ہے "

نرگس نے کہا۔ اور مجھے بھی۔

نمی نے سر ہلا کے کہا۔ تو کیا پھر ایرانی پلاؤ آئے گا۔ پھر پیٹ میں درد ہوگا پھر میدان کے چکر اور پھر بھوک ـــــ "

کلدیپ کور نے بڑی تلخی سے کہا۔
نمی نے کہا۔ "میں دو پیسے دے سکتا ہوں"
میں نے کہا۔ "ایک آنہ میری طرف سے"
سب مل کر چار آنے ہوئے۔ نمی کو ایرانی پلاؤ لانے بھیجا گیا کہ سب سے چھوٹا وہی تھا۔ پھر ایرانی ریستوران کا باورچی اسے پسند بھی کرتا تھا ممکن ہے نمی کو دیکھ کر چار آنے میں دو پلیٹوں کی بجائے تین پلیٹیں یا کم از کم تین پلیٹوں کا مال مل جائے۔
جب نمی چلا گیا تو میں نے پوچھا۔
"کیا تم لوگ ہر روز یہیں سوتے ہو۔"
"مدھو بالا کے سوا اور سب یہیں سوتے ہیں ——" ککو نے کہا۔ مدھو بالا اپنے گھر جاتا ہے۔ مگر آج نہیں گیا۔
"میں نے مدھو بالا سے پوچھا
"تمہارا گھر ہے؟
"ہاں —— سائین میں ایک جھونپڑا ہے ماں وہاں رہتی ہے"
"اور باپ ——"
مدھو بالا نے کہا۔
"باپ ——؟ باپ کا مجھے کیا پتہ؟ ہوگا سالا سامنے والی کسی بلڈنگ کا سیٹھ ——"
یکایک وہ سب چپ ہو گئے۔ جیسے کسی نے ان کے چہرے پر چپت ماری ہو

لڑکے جو بے آسرا تھے۔ بے گھر تھے۔ بے نام تھے۔ جنھوں نے اپنی زندگی میں کبھی نہ آنے والی محبت کو فلمی گانوں سے بھرنے کی کوشش کی تھی۔

تیرا میرا پیار ہو گیا ـــــ کدھر ہے تیرا پیار ـــــ اے میرے باپ ـــ اے میری ماں ـــــ اے میرے بھائی تو کون ہے۔

تو کون تھا؟

کس لئے تو مجھے اس دنیا میں لایا اور ان سخت بے رحم عمارتوں کے ٹیکس زدہ فٹ پاتھوں پر دھکے کھانے کے لئے چھوڑ دیا

ایک لمحہ کے لئے ان لڑکوں کے فق فریادی چہرے کسی نامعلوم ڈر سے خوفزدہ ہو گئے۔ اور بڑی سختی سے انہوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ لئے جیسے کہیں سے انہیں آسرا نہ ملا۔ جیسے اس شہر کی ہر بڑی عمارت ہر فٹ پاتھ اور ہر چلنے والے قدم نے انہیں ٹھکرا دیا اور انہیں مجبور کر دیا کہ وہ رات کی تاریکی میں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ لیں

مجھے وہ اس وقت ایسے ہی خوفزدہ اور معصوم معلوم ہو رہے تھے جیسے بھولے بھٹکے بچے کسی نامعلوم بے کنار جنگل میں کھو جائیں۔ اسی لئے بمبئی کبھی کبھی مجھے ایک شہر نہیں معلوم ہوتا ایک جنگل معلوم ہوتا ہے۔ جس میں معاشرے کی بے نام اولاد سڑکوں کی بھول بھلیوں میں اپنا راستہ ٹٹولتی معلوم ہوتی ہے اور جب راستہ نہیں ملتا تو آنکھیں بند کر کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ جاتی ہے پھر میں سوچتا ہوں ایسا نہیں ہے۔

بمبئی ایک جنگل نہیں ہے۔ شہر ہے ـــــ لوگ کہتے ہیں اس کی ایک

میونسپل کارپوریشن ہے۔ اس کی ایک حکومت ہے ایک نظام ہے۔ اس کی گلیاں ہیں بازار ہیں۔ دوکانیں ہیں۔ راستے ہیں اور گھر ہیں۔

اور یہ سب ایک دوسرے سے ایسے جڑے ہوئے ہیں جیسے ایک مہذب اور متمدن شہر میں چیزیں ایک دوسرے سے منسلک ہوتی ہیں

یہ سب میں جانتا ہوں۔ اس کے رستے اور گھروں کو پہچانتا ہوں ان کی عزت اور احترام کرتا ہوں لیکن اس عزت اور احترام اس محبت کے باوجود میں یہ کیوں دیکھتا ہوں کہ اس بمبئی شہر میں کتنی ہی گلیاں ایسی ہیں جن سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

کتنے ہی راستے ایسے ہیں جو کسی منزل کو نہیں جاتے ـــــ کتنے ہی بچے ایسے ہیں جن کے لئے کوئی گھر نہیں ہے۔

لیکا یک اس خاموشی کو نمی نے توڑ دیا۔

وہ بھاگتا ہوا ہمارے سامنے آگیا ـــــ اس کے ہاتھ میں ایرانی پلاؤ کی تین پلیٹیں تھیں۔ ان سے گرم گرم سوندھا سوندھا دھواں اٹھ رہا تھا جب اس نے پلیٹیں لاکر گھاس پر رکھ دیں تو ہم نے دیکھا ـــــ کہ نمی کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔

"کیا ہوا ـــ؟"

کلدیپ کور نے پوچھا

نمی نے غضبناک لہجے میں کہا۔

"باورچی نے بڑے زور سے یہاں کاٹ کھایا ـــــ" نمی نے اپنا بایاں

رخسار ہماری طرف کر دیا۔

ہم نے دیکھا ـــــ رخسار پر بہت بڑا نشان تھا۔!

کلیدپ کور نے باورچی کو گالی دیتے ہوئے کہا۔

"حرامزادہ ـــــ"

مگر اس کے بعد وہ سب لوگ ایرانی پلاؤ پر ٹوٹ پڑے۔